خصوصی اشاعت
ہر اتوار کو روزنامہ اسلام کے ساتھ شائع ہوتا ہے
بچوں کا اسلام
روزنامہ اسلام
600 اتوار 18 صفر 1435ھ مطابق 22 دسمبر 2013ء
ادب ہے قرینہ
داستان زندگی کی
سائبان
معصوم اُمنگیں
کتابی کردار
آزادی کی قیمت
دہلی ربڑی ہاؤس
برنس روڈ کراچی
سردیوں کی سوغات
دیسی گھی سے تیار کردہ اسپیشل
پنجیری
گاجر کا حلوہ

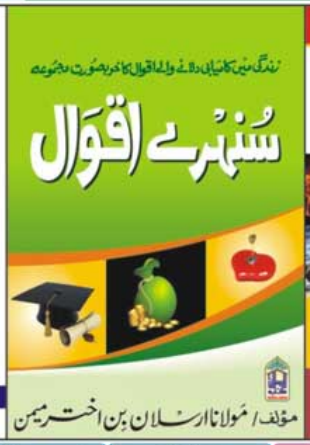

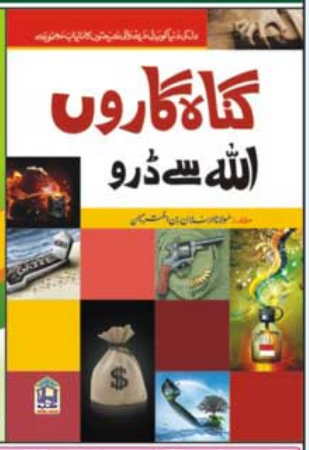

22 انمول خوبصورت نادر تصویری البم کا یادگار تحفہ
مکتبہ ارسلان
قرآن محل مارکیٹ، دکان نمبر 6 اردو بازار کراچی۔
رابطہ: 0333-2103655
www.maktabaarsalan.com
E-mail: maktaba.arsalan@gmail.com
گناہگاروں
اللہ سے ڈرو
سنہرے اقوال
مایوسی
کو شکست دینے والے
مؤلف/ مولانا ارسلان بن اختر میمن
تصاویر بیت اللہ اور مکہ المکرمہ
تبرکات خلفاء راشدین
فتنہ دجال اور حضرت عیسیٰ
اللہ کے وجود کے حیران کن دلائل
تصاویر مسجد نبوی اور مدینۃ المنورہ
عذاب الٰہی
انمول جواہرات
تبرکات نبوی
مقامات انبیاء
حیوانات قرآنی
زیارات حرمین
آثار نبوی
تبرکات صحابہ
پرندے قرآن کی روشنی میں
اسلامی زیارات
تبرکات انبیاء
تبرکات اولیاء
علامات قیامت
مقدس مقامات
کراچی 0323-2077997
راولپنڈی 051-4830451
ملتان 061-4514929
کوئٹہ 081-2662263
لاہور 042-37224228
پشاور 0301-8845717
فیصل آباد 0321-7693142
ڈیرہ اسماعیل خان 0966-717806

انمول تحفہ
Digital
معلم
Learn Islam
AHSAN UL KALAM
Islamic Gadgets
احسن الکلام
بچوں کی ایمانی اور اخلاقی تربیت کے لیے بہترین ڈیوائس
قرآنی سورتیں
مسنون دعائیں
کلمہ طیبہ درود شریف
صرف بٹن کو ٹچ کریں اور
پڑھیں
سنیں
حفظ کریں
سیکھیں
تصدیق شدہ
Bundle Offer:
Ipad+Laptop
just in Rs.800/-
Ipad
Laptop
DANY
www.ahsanulkalam.org | 111-000-170 | 0333-3228722 - 0333-33309104

AL-SIBGHA SCHOOL SYSTEM
الصبغہ سکول سسٹم
زیر سرپرستی
حضرت اقدس مولانا نعیم الدین صاحب دامت برکاتہم العالیہ
اُستاذ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور
Combination of Hifz-e-Quran & Schooling
Quality Education for the Success of Here & Hereafter
Registered with Lahore Board
ENGLISH MEDIUM
AL.SIBGHA SCHOOL
پاکستان کا پہلا اسلامی مونٹیسوری ادارہ
The only institute that provides (IT) training under the supervision of
Microsoft Certified Trainer (MCT) and CompTIA (A+) IT Professional Member
Play Group
Nursery
Prep
Class I-X / "O" Levels
داخلے جاری ہیں
پلے گروپ: 3 سے 4 سال
نرسری: 4 سے 5 سال
پریپ + (قاعدہ): 5 سے 6 سال
کلاس I + (ناظرہ): 6 سے 7 سال
کلاس II + (آغاز حفظ): 7 سے 8 سال
کلاس III + (حفظ): 8 سے 9 سال
کلاس IV + (حفظ): 9 سے 10 سال
تا میٹرک/"O" لیول
رابطہ: رجسٹریشن ڈیسک
8:00 تا 3:00 بجے روزانہ (علاوہ اتوار)
Splendid Blend of Islamic & Contemporary Education
حفظ قرآن "او" لیول/میٹرک سسٹمز کیساتھ
تجوید کیساتھ ناظرہ قرآن پاک
حفظ کے شعبہ میں خصوصی مہارت
حفظ کے بعد پڑھائی کیلئے اسکول میں دہرائی کا انتظام
دینی شعار اور اقدار کے مطابق تربیت
ٹرانسپورٹ کا معقول انتظام
پلے گروپ سے سپوکن انگلش کلاسز
انگلش میڈیم بمعہ کمپیوٹر (IT) کلاسز
تدریسی عملہ تجربہ کار اساتذہ پر مشتمل
معیاری تعلیم مکمل آڈیو، ویڈیو مانیٹرنگ کیساتھ
غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے وسیع مواقع
مکمل ایئر کنڈیشنڈ کلاس رومز
مار پیٹ سے پاک ترغیبی ماحول
داخلہ جاری ہے
پنجاب ایگزامینیشن کمیشن / لاہور بورڈ کے تحت 2014ء میں ہونے والے
امتحانات کیلئے پانچویں (5th)، ہشتم (8th) اور نہم (9th) کلاسز میں محدود نشستوں پر
اہم انتباہ:
"الصبغہ سکول سسٹم" ایک رجسٹرڈ ادارہ ہے جس کی بوائز اور گرلز برانچ صرف مین غزالی روڈ، سمن آباد، لاہور
میں واقع ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان میں کہیں بھی "الصبغہ سکول سسٹم" کی کوئی برانچ نہیں ہے۔ چنانچہ "الصبغہ" کے
نام سے کوئی بھی ادارہ چلانا قانوناً جرم ہے۔ ایسا کرنیوالوں کے خلاف قانونی کاروائی کا حق ادارہ محفوظ رکھتا ہے۔
196-197-N، مین غزالی روڈ، نزد بوہڑ والا چوک، سمن آباد، لاہور
Tel: 042-37523610-37566669-37026110-8417111 Cell: 0300-0321-9415949
Website: www.alsibgha.edu.pk

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتنا اچھا رکھوالا

''اور اللہ کے راستے میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں (اپنے دین کے لیے) منتخب کرلیا ہے اور تم پر دین کے معاملے میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔ اپنے باپ ابراہیم کے دین کو مضبوطی سے تھام لو، اس نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس قرآن میں بھی، تاکہ یہ رسول تمہارے لیے گواہ بنیں اور تم دوسروں کے لیے گواہ بنو، لہٰذا نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کو مضبوطی سے تھامے رکھو، وہ تمہارا رکھوالا ہے۔ دیکھو کتنا اچھا رکھوالا اور کتنا اچھا مددگار! (سورۃ الحج:78)

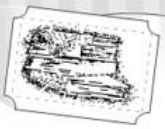

اس کا ضامن ہے

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس شخص کا ضامن ہے جو اس کی راہ میں جہاد کے لیے نکلا۔ جو صرف اللہ پر ایمان لانے اور پیغمبروں کی تصدیق کرنے کی وجہ سے نکلا۔ (یہ ایمان رکھتے ہوئے) کہ اللہ تعالیٰ اسے ثواب اور غنیمت کے ساتھ واپس لوٹائیں گے یا اسے جنت میں داخل کریں گے۔

(مشکوٰۃ)

دو باتیں

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ: ایک بات واضح طور پر کہی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ میرا اور آپ سب کا چولی دامن کا ساتھ ہے... آپ کا اور بچوں کا اسلام کا بھی چولی دامن کا ساتھ ہے... لیکن دو باتیں کا اور خاص شمارے کا چولی دامن کا ساتھ ہرگز نہیں ہے جب کہ میری یہ عین خواہش ہے کہ ان کا بھی چولی دامن کا ساتھ ہونا چاہیے... لیکن ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے... مطلب یہ کہ یہ خواہش ایسی ہے کہ میرا دم نکلنے لگتا ہے... اور اس کی وجہ ہے... ہر بار عام طور پر یہ تبصرے موصول ہوتے ہیں... خاص نمبر ایسا تھا، اتنا اچھا تھا... یعنی اس پر بھرپور تبصرہ ہوتا ہے... لیکن ساتھ میں لکھا نظر آتا ہے، دو باتیں اچھی نہیں تھیں...

بس صرف ایک خاص شمارے کی دو باتیں تقریباً سبھی قارئین نے پسند کی تھیں... اور وہ دو باتیں وہ تھیں جو میں نے مسجدِ نبوی میں روضہ مبارک کے سامنے بیٹھ کر لکھی تھیں... اس کے بعد پسندیدگی کی ان حدود کو کوئی دو باتیں نہ چھو سکیں... اب دیکھیے... اس کا واحد حل تو یہ ہے کہ میں ہر سال خاص شمارے سے پہلے عمرہ کرنے چلا جایا کروں... اور وہاں بیٹھ کر دو باتیں لکھا کروں... لیکن یہ کم از کم میرے لیے ممکن نہیں... ہاں اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہیں، وہ ایسے اسباب پیدا کردیں تو یہ عین ممکن ہے، بلکہ عین ممکن سے بھی بڑھ کر ممکن ہے... کیا خیال ہے آپ کا... اس سلسلے میں آپ سب دعا تو کر ہی سکتے ہیں نا... ہوسکتا ہے، آپ کی دعائیں رنگ لے آئیں اور آپ کو بچوں کا اسلام کی دو باتیں بھی رنگ برنگی نظر آنے لگیں...

ویسے آپ شکر کریں... اس بار بھی تاریخ نے اپنے آپ کو نہیں دہرایا... شاید تاریخ اپنی یہ عادت بچوں کا اسلام کے سالنامے یا خاص شمارے کی حد تک بھول گئی ہے... حالانکہ تاریخ تو خود ہوتی ہی ہے ''یاد'' دلانے کے لیے... یعنی تاریخ ہمیں ہمارے اسلاف کی اور دنیا کے واقعات کی یاد دلاتی ہے... خیر کہنے کا مطلب یہ کہ الحمدللہ! میں خیریت سے ہوں اور خاص شمارہ بھی خیریت سے ہی تیار ہوا... اس بار یہ ذکر کرکے آپ کو بور نہیں کروں گا کہ خاص شمارے میں کیا کچھ ہے... یا اس میں کس کس مہربان کی تحریر شامل ہے... یا کس کس مہربان نے حصہ لیا ہے... اور کن کن مہربانوں نے اپنی نامہربانیوں کے ثبوت دیے ہیں... چھوڑیں ان باتوں پر کیا جانا... شمارہ آپ دیکھ ہی لیں گے... یعنی پڑھ لیں گے اور آپ کے موصول ہونے والے خطوط انصاف کے تقاضے کو پورا کرہی دیں گے...

مجھے اندازہ ہے... ان دو باتیں کو پڑھ کر بھی آپ یہی لکھیں گے، شمارہ 600 یعنی خاص شمارے کی دو باتیں بس ایویں سی تھیں... پتا نہیں آپ کو کیا ہوگیا ہے... اب آپ پہلی جیسی دو باتیں نہیں لکھتے... اس سلسلے میں اوپر لکھ ہی چکا ہوں... لہٰذا بات تو آپ کے دعا کرنے نہ کرنے کی ہے... قبول ہونے یا نہ قبول ہونے کی ہے... میں تو اپنی طرف سے کوشش ہی کرسکتا ہوں... کسی چیز کو حد درجے خوب صورت بنانا... یا بہترین بنانا... یا بے مثال بنانا... یا لاجواب بنانا... میرا کام نہیں، کر دیا نہ آپ کو لاجواب... اور رہ گئے نا آپ اپنا سا منہ لے کر... اگر نہیں... تو پھر دیجیے اس سوال کا جواب... کیا یہ میرے اختیار میں ہے... کسی بھی انسان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں... ہاں کوشش کرنے کا حکم ہے... بے لوث کوشش... پرخلوص کوشش... اس پر بھی اگر آپ یہی کہیں... بس جی دو باتیں ایویں سی تھیں... تو میں تو خود کو بھی ایویں سا سمجھتا ہوں... دو باتیں ہی کی کیا بات ہے...

لگتا ہے... دو باتیں کی جگہ پُر ہونے کے قریب ہے... میں آپ سے ایک بار پھر ایک ہفتے کے لیے جدا ہونے کو ہوں... زندہ رہا تو آئندہ ہفتے پھر انھی دو باتیں میں آپ سے ملاقات کروں گا... تاکہ معلوم ہوجائے... زندگی کا کارواں جاری وساری ہے... اور امید پر دنیا قائم ہے اور درویش کی صدا کیا ہے... کچھ بھی تو نہیں... یہ درویش بھی تو بس ''ایویں'' سا ہی انسان ہے... جب دیکھو دو باتیں کے آخر میں اپنی ٹانگ اڑا بیٹھتا ہے... اس سے پہلے کہ دو باتیں بالکل ہی اوٹ پٹانگ ہوجائیں... اور ان پر ''فضول'' کی چھاپ لگنے کے امکانات بہت زیادہ روشن ہوجائیں... میں اجازت ہی لے لیتا ہوں... ویسے بھی تو آپ بہت دیر سے اجازت دینے کے لیے بے چین بیٹھے ہیں... میرا مطلب ہے پر تولے ہوئے ہیں... ان سے بھی انصاف ہونا چاہیے... شکریہ! آپ کی آرا کا شدت سے منتظر!

والسلام

سالانہ زرِتعاون اندرونِ ملک: 600 روپے، بیرونِ ملک: 3700 روپے

خط کتابت کا پتہ ''بچوں کا اسلام'' دفتر روزنامہ اسلام ناظم آباد 4 کراچی فون: 021 36609983

بچوں کا اسلام انٹرنیٹ پربھی: www.dailyislam.pk ای میل: bkislam4u@gmail.com

دادا ابو

حافظ عبدالجبار سیال۔ لاہور

''یار! دادا ابو کو کوئی کتاب ہی لا دو جس میں حاتم طائی کی سخاوت کے قصے ہوں۔ کتنا پیسہ آتا ہے۔ معلوم نہیں جاتا کہاں ہے۔ سانپ بن کے بیٹھے ہوئے ہیں ہماری کمائیوں پر۔ مجال ہے کہ ذرا سا غم ہو ہم پوتوں کا۔ حد ہو گئی ہے کنجوسی کی۔ جب بھی ان سے پیسے مانگو پہلے انکوائری شروع کر دیتے ہیں۔ کتنا مشکل ہے ان سے پیسے نکلوانا۔''

چھوٹا بھائی ارسلان آج بہت غصے میں تھا۔ ہمارے دادا ابو گھر میں کنجوس مکھی چوس مشہور تھے۔ انھیں کوئی بھی چوس کہنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ حد درجہ احترام تھا، سب گھر والوں میں۔ اس کی وجہ والد صاحب کی ان سے بے پناہ محبت تھی۔ ساری کمائی دادا ابو کے ہاتھ میں رکھ کر وہ بہت خوشی محسوس کرتے اور پھر دادا ابو اخراجات کے لیے جتنی رقم لوٹا دیتے، اسے گنے بغیر ہی جیب میں ڈال لیتے۔ یہ بات نہیں تھی کہ دادا ابو ہمارے اخراجات ہی کا خیال نہ رکھیں۔ وہ سب گھر والوں کی ضرورت کا پورا پورا خیال رکھتے۔ اس بڑھاپے میں رقم کی زیادہ ضرورت بھی انھیں نہیں تھی۔ سگریٹ پان سے تو وہ ہمیشہ سے پرہیز کرتے تھے۔ خود بھی سادہ تھے اور ہمیں بھی سادگی پر لیکچر دیتے رہتے تھے۔ اس لیے ضرورت سے زاید کسی خرچ کے لیے ان سے پیسے مانگنا خود کو تفتیش کے لیے پیش کرنے کے برابر تھا۔

''یاروں دوستوں میں اڑاتے ہوں گے ساری رقم اور کیا؟''

میں نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

دادا ابو ہر دل عزیز شخصیت تھے۔ دور اور نزدیک کے بے شمار لوگ دادا ابو سے ملنے آتے رہتے۔ کبھی کبھار ان لوگوں کی دعوت پر بھی چلے جاتے تھے۔ اکثر ہمیں کہا کرتے:

''بچو! بچت کیا کرو بچت! اپنے لیے نہیں تو دوسروں کے لیے۔''

دادا ابو کا اپنے لیے بچت کرنا تو سمجھ میں آتا تھا مگر کسی کے لیے بچت کرنے کا مطلب ہماری سمجھ سے باہر تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ اس دوران دادا ابو کو گردوں کی تکلیف ہو گئی۔ ان کا علاج ہونے لگا۔ مگر ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' کے مصداق دادا ابو بہت کمزور ہونے لگے۔ ایک دن انھوں نے ہم دونوں بھائیوں کو اپنے کمرے میں بلایا۔

''بچو! میری ایک وصیت یاد رکھنا۔ میرے چلے جانے کے بعد یہ لوگوں کا آنا جانا بند نہ ہونے دینا۔ تمہارے ابو کو بھی کہہ دیا ہے۔''

''مگر یہ لوگ کیوں آتے ہیں یہاں۔''

''بیٹا معلوم ہو جائے گا۔''

''دادا ابو آپ تو بس یوں ہی فکر مند ہو رہے ہیں۔ کہیں نہیں جا رہے آپ! ضرورت ہے ہمیں آپ کی۔''

''بچو! یہاں سدا کون رہا ہے جو میں رہوں گا۔''

پھر وہ ایک دن اسی تکلیف میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جب گھر سے اُن کا جنازہ اُٹھا تو کچھ اور ہی منظر تھا۔ جس دادا ابو کو ہم اپنے لیے بوجھ سمجھتے تھے، وہ تو گھر کی رونقیں ہی ساتھ لے گئے۔ یوں احساس ہونے لگا جیسے چھت سے محروم ہو گئے ہوں ہم۔ گھنے سائے سے کڑکتی دھوپ میں آ گئے ہوں۔

دادا ابو کی وفات کے بعد تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ نہ معلوم کہاں کہاں سے لوگ اظہار افسوس کے لیے آنے لگے۔ کچھ دن یوں ہی گزر گئے۔ ایک صبح گھر کا دروازہ بجا۔ میں نے دروازہ کھولا تو کچھ لوگ وہاں موجود تھے۔

''بیٹا! آپ کے دادا ابو ''اللہ بخش'' سے ملنے آئے ہیں۔''

''جی! وہ تو اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔''

''کیا!'' سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ آنے والوں میں ایک شخص اپنا دل پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''پتر! مرحوم بہت عظیم انسان تھے۔ میری دو بچیوں کی شادی کا خرچ انھوں نے برداشت کیا تھا۔ اوکھے سوکھے وقت کام آتے تھے۔ آج اس خبر کے بعد تو ہمارے سر سے چادر اُتر گئی ہے پتر! سوچ رہا ہوں اب کون چھپائے گا ہماری غریبی کو۔''

ایک اور بولا: ''بیٹا میں ٹوکرے پر دال سبزیاں رکھ کر بیچا کرتا تھا۔ آپ کے دادا ابو نے مجھے ایک ریڑھی خرید کر دی تھی۔ ماشاء اللہ آج میرا کاروبار چمک گیا ہے۔ صبح صبح یہ کیا خبر سنا دی آپ نے۔ جگر پھٹا جا رہا ہے میرا۔''

اتنے میں ہمارا ہمسایہ رشید ہوٹل والا بھی اس گفتگو میں شامل ہو گیا: ''اللہ بخش کے کیا کہنے! میرے بچوں کو سکول میں داخل انھوں نے ہی تو کروایا تھا۔ آدھی فیس معاف ہو گئی تھی۔ باقی آدھی فیس وہ اپنی جیب سے ادا کیا کرتے تھے۔''

''عمر بیٹا! خود کو کبھی اکیلا نہ سمجھنا! ہم تیرے ساتھ ہیں۔ تیرے دادا ابو کے ہمارے اوپر بڑے احسانات ہیں۔'' یہ الفاظ اکرام ویلڈنگ والے کے تھے جو چلتے راہ رُک گیا تھا۔ وہ مزید بتانے لگا:

''ہمیں یاد پڑتا ہے جب ہمارے والد صاحب کا آپریشن ہوا تھا، اس وقت تمہارے دادا ابو ماشاء اللہ جوان تھے۔۔ ساری ساری رات ہسپتال میں گزارتے۔ والد صاحب ایک لمبی مدت تک ہسپتال میں رہے۔ ہم بھی اُکتا گئے تھے مگر اللہ بخش تھا کہ اُسے رات بھر اُونگھ بھی نہیں آتی تھی اور جب والد صاحب ہسپتال سے گھر واپس آئے تھے تو انھوں نے مٹھائی بانٹی تھی اور اتنے خوش تھے کہ جیسے ان کے اپنے والد گھر آئے ہوں۔ ہم نے آپریشن کے لیے اُن سے دس ہزار روپے قرض لیے تھے۔ بعد میں انھوں نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ ''وہ تو قرضِ حسنہ تھا'' اللہ میاں سے جا کر کئی گنا لوں گا۔''

دادا ابو کے احسانات گنوانے والے ابھی اور لوگ بھی تھے مگر میری اور ارسلان کی حالت یہ ہو رہی تھی کہ ''کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔''

ہم نے دل ہی دل میں دادا ابو کی وصیت پر عمل کرنے کا عزم کر لیا تھا۔

جو اثرات سے قیمتی

- اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھنا حماقت ہے۔
- جو شخص قربانی اور ایثار سے کام لیتا ہے، وہ مر کر بھی زندہ رہتا ہے۔
- خوش رہنا چاہتے ہو تو دوسروں کو خوشی دو۔
- جو شخص دولت خرچ کرنے سے ڈرتا ہے، وہ دولت پانے کا حق دار نہیں۔
- حاسد کسی بھی چیز پر راضی نہیں ہوتا۔
- جو شخص ناگوار بات کہے گا، وہ ناگوار بات سنے گا۔
- سوچے سمجھے بغیر کسی کی بات پر عمل نہ کرو۔
- بڑی برائی کا آغاز چھوٹی برائی ہی سے ہوتا ہے۔
- شریف آدمی اپنے محسن کو فراموش نہیں کر سکتا۔
- جب دعا سے بات نہ بنے تو اپنا فیصلہ اللہ پر چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حق میں بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

رفعت بتول جھاوریاں۔ محمد عمر فاروق مانسہرہ۔ حماسہ اکرام دیپال پور

ایک مردِ درویش

ظفر منصور ۔ ملتان

یہ سن 2000 کا ذکر ہے، میں اور میرے چند دوست افغانستان کے معلوماتی دورے پر تھے، ماہِ جون کی ایک تپتی دوپہر میں جب ہم قندھار شہر میں واقع سپریم کورٹ کی عمارت میں اسلامی عدالتوں کے اعلیٰ عہدیداروں سے ملاقاتیں کر کے واپس سرکاری مہمان خانے میں پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ طالبان کے راہنما امیر المومنین ملا محمد عمر مجاہد آپ کا انتظار کر رہے ہیں، طالبان کے دور میں افغانستان کا دورہ کرنے والے کسی بھی شخص کے لیے ملا عمر صاحب سے ملاقات سب سے پرکشش مرحلہ ہوتا تھا، حالانکہ یہ بات سبھی کو معلوم تھی کہ ملا عمر اپنی گوناگوں مصروفیات اور حفاظتی نقطہ نظر سے بہت ہی کم لوگوں سے ملا کرتے تھے، خاص طور پر غیر ملکیوں سے ان کی ملاقاتوں کو تو انگلیوں پر بھی شمار کیا جا سکتا ہے، ان کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے غیر ملکی سرکاری نمایندوں سے ملاقاتیں بھی اپنے وزراء اور مشیروں پر چھوڑ رکھی تھیں، البتہ شاذ و نادر وہ خود بھی ان سے مل لیا کرتے تھے، مثلاً اقوامِ متحدہ کے نمایندے الاخضر الابراہیمی اور سعودیہ کے شہزادے ان چند افراد میں سے ہیں جن سے ملا عمر صاحب نے خود ملاقات کی تھی مگر ملا صاحب سے ملاقات کی راہ میں ان مشکلات کے باوجود ہم نے اپنے طور پر طالبان راہنماؤں قندھار کے والی محمد حسن صاحب اور ملا عمر کے مشیرِ خاص طیب آغا سے پُرزور اصرار کر کے اپنا مطالبہ منوا لیا تھا اور اب انھوں نے ہماری ملاقات کا بندوبست کر لیا تھا۔

طالبان کا سرکاری مہمان خانہ شہر سے باہر واقع تھا، جہاں سے میں اور میرے دیگر ساتھی طالبان کی سرکاری گاڑیوں میں بیٹھ کر قندھار شہر کے اندر واقع شہداء چوک کے قریب اس مقام کی جانب روانہ ہوگئے جسے وہاں کے لوگ ''والی کوٹھی'' (گورنر ہاؤس) کہتے ہیں، والی کوٹھی دراصل قندھار کے گورنر ملا محمد حسن کا سرکاری دفتر تھا مگر 1999 میں جب ملا محمد عمر صاحب کو نشانہ بنانے کے لیے بعض بیرونی طاقتوں نے اپنے زرخرید ایجنٹوں کے ذریعے قندھار میں ایک طاقتور بم دھماکا کیا تھا تو اس کے بعد سے طالبان کے راہنما نے اپنے پرانے دفتر میں جانا ترک کر دیا اور اب وہ عموماً والی کوٹھی ہی میں بیٹھ کر فرائضِ منصبی سرانجام دیتے تھے، اس کی ایک بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ والی کوٹھی کے برابر ہی میں ملا صاحب کی رہائش گاہ تھی۔

قندھار شہر کی مرکزی سڑک سے ہوتی ہوئی جب ہماری گاڑیاں والی کوٹھی کے سامنے پہنچیں تو قافلے کے بیشتر شرکاء دنگ رہ گئے، کیونکہ والی کوٹھی کی عمارت ان کی توقع سے کچھ زیادہ ہی سادگی سے بنائی گئی تھی، یہ درست تھا کہ ہمارے قافلے کے بیشتر شرکاء ایسے تھے جنھوں نے طالبان کو اس سے پہلے دیکھا نہیں تو سن ضرور رکھا تھا، مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بہرحال ان کے لیے حیران کن تھا کہ افغانستان کے پچانوے فیصد علاقے پر حکمرانی کرنے والے طالبان کے گورنر ہاؤس کے باہر نہ کوئی سکیورٹی فورسز کا گشت تھا، نہ حفاظتی انتظامات اور نہ ہی انھیں پروٹوکول دینے کے لیے مسلح اہلکاروں کے چاق و چوبند دستے۔ والی کوٹھی کی عمارت بھی انتہائی سادہ طرزِ تعمیر کا نمونہ تھی جس کے بیشتر حصے کو بم دھماکے میں منہدم ہو جانے کی وجہ سے دوبارہ تعمیر کیا گیا تھا۔ اس وقت گورنر ملا حسن صاحب ہمارے ساتھ تھے، والی کوٹھی کے دروازے پر پہنچتے ہی انھوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چھوٹے سے وائرلیس سیٹ پر مخصوص فریکوئنسی سیٹ کی اور والی کوٹھی کے اندر رابطہ کر کے مہمانوں کے پہنچنے کی اطلاع دی اور اس رابطے کے چند لمحے بعد ہی ہماری گاڑیوں کے لیے والی کوٹھی کا آہنی دروازہ کھول دیا گیا۔ دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد والی کوٹھی کے سامنے والا حصہ ہمارے سامنے تھا جو ابھی تعمیری مراحل سے گزر رہا تھا۔ ہمارے طالبان ڈرائیوروں نے گاڑیاں ایک بغلی راستے سے گزاریں اور اب ہم والی کوٹھی کے عقبی حصے میں پہنچ گئے۔ جہاں چند کمرے تھے اور ان کے برآمدے میں کھڑے چند طالبان راہنما مہمانوں کے منتظر تھے، گاڑیاں رکتے ہی انھوں نے آگے بڑھ کر مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور پھر اُن میں سے ملا محمد عمر صاحب کے مشیرِ خصوصی طیب آغا صاحب نے آگے بڑھ کر ہماری ایک کمرے کی طرف راہنمائی کی۔ اس کمرے سے گزر کر ہم ایک اور کمرے میں داخل ہو گئے۔ ملا محمد عمر صاحب سے ملاقات کے لیے پرانے افغان طرز کے بنے ہوئے موٹی موٹی دیواروں والے ان کمروں سے گزرتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے پراسراریت کا احساس ضرور ہوا، لیکن جونہی ہم

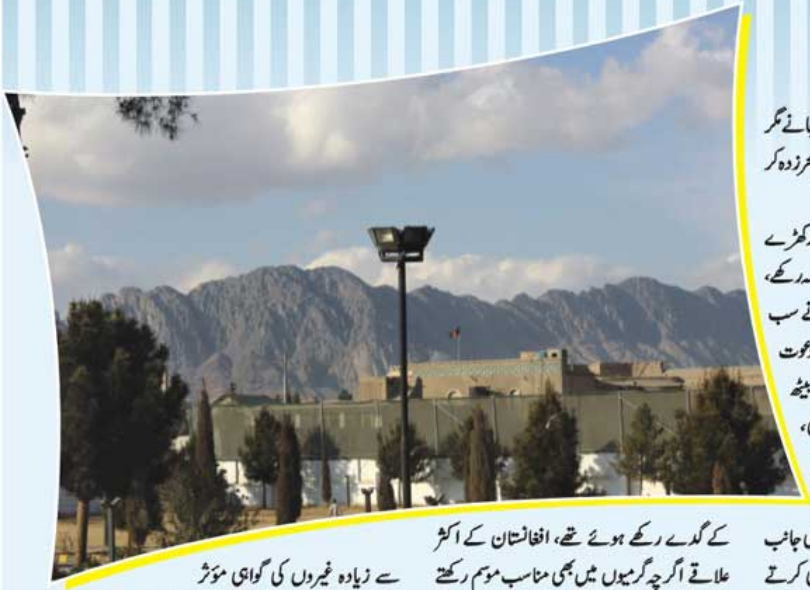

دوسرے کمرے میں داخل ہوئے تو ایک انجانے مگر پروقار نورانی ماحول نے سب کے دلوں کو گویا سحر زدہ کر کے رکھ دیا:

ہمارے سامنے امیر المومنین ملا محمد عمر مجاہد کھڑے تھے، دراز قد، وجیہ شکل وصورت سر پر سیاہ عمامہ رکھے، سادہ سے کپڑوں میں ملبوس ملا صاحب نے سب مہمانوں سے معانقہ کیا اور پھر انھیں بیٹھنے کی دعوت دیتے ہوئے خود بھی اس مسہری کا سہارا لے کر بیٹھ گئے جس پر گدّا تو بچھا ہوا تھا مگر چادر غائب تھی، ملا صاحب نے خود اس مسہری سے ٹیک لگائی اور مہمانوں کو گاؤ تکیے پیش کیے، بیٹھنے کے بعد کچھ دیر تک تو سبھی مہمان اس عظیم شخصیت کی جانب دیکھتے ہی رہے جو اتنے بڑے ملک پر حکمرانی کرتے ہوئے بھی اس قدر سادہ طرز زندگی بسر کر رہا تھا۔ جی ہاں! امیر المومنین کے کمرہ ملاقات میں نہ آرام دہ صوفے تھے، نہ خوب صورت کرسیاں، نہ کاغذاتِ صدارت سے سجی دھجی میز تھی اور نہ ہی کمرے کی چھت پر کوئی چمکتا دمکتا فانوس لٹکتا نظر آ رہا تھا، بس ایک افغانی قالین تھا جو پورے کمرے میں بچھا ہوا تھا اور اس کے چاروں جانب افغان طرز کے مطابق روئی کے گدے رکھے ہوئے تھے، افغانستان کے اکثر علاقے اگرچہ گرمیوں میں بھی مناسب موسم رکھتے ہیں مگر قندھار ان میں سے نہیں، شہر کے آس پاس پھیلے ہوئے وسیع وعریض ریگستانی علاقے کی وجہ سے گرمیوں میں اس شہر میں شدید گرم موسم ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود امیر المومنین کے دفتر میں ہماری نگاہوں کو ایک بھی ایئر کنڈیشنر دکھائی نہ دیا، کیونکہ ملا محمد عمر اور ان کے دیگر عہدیدارانِ امارت ایسے ہی موسم میں گزر بسر کرتے رہے ہیں۔ امیر المومنین نے مہمانوں سے انتہائی دھیمے انداز میں خیر و عافیت دریافت کی اور پھر باقاعدہ گفتگو کا آغاز ہوا، گفتگو کے دوران طالبان حکومت کی داخلی و خارجی پالیسیوں کے بارے میں مختصر مگر سیر حاصل بات چیت ہوئی، ملا محمد عمر صاحب نے آنے والے مہمانوں کے مشورے خندہ پیشانی سے سنے اور مختصر الفاظ میں ان کے سوالات کے جوابات دیے۔ گفتگو کے دوران جب بعض مہمانوں نے طالبان کے راہنما کو مشورہ دیا کہ وہ بیرونی دنیا میں طالبان کے لیے رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے طالبان کے اعلیٰ عہدیداروں پر مشتمل ایک باقاعدہ وفد ترتیب دیں تو ملا صاحب نے جواب دیا کہ یہ کام اگر آپ لوگ کریں تو زیادہ بہتر ہے، کیونکہ طالبان کے حق میں اپنوں سے زیادہ غیروں کی گواہی مؤثر ہو سکتی ہے، ملا صاحب سے ہمارے وفد کی گفتگو تقریباً آدھے گھنٹے تک جاری رہی اور پھر ہم نے ان سے رخصت ہونے کے لیے اجازت چاہی۔ رخصت کرتے ہوئے انھوں نے ایک مرتبہ پھر سب سے معانقہ کیا۔ اس موقعے پر ہمارے ایک دوست نے جب اُن سے کہا کہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے شہادت عطا فرمائیں، تو انھوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا، ''اللہ تعالیٰ آپ کو وہ مقام عطا فرمائے جو انھیں پسند ہو'' اور پھر ہم سب امیر المومنین سے رخصت ہو گئے۔ امیر المومنین سے ملاقات کے بعد ہم والی کوٹھی سے نکلے۔ پھر دو چار دن بعد افغانستان سے بھی لوٹ آئے اور آخر ایک دن ایسا بھی آیا جب یہ اندوہ ناک خبریں سننے کو ملیں کہ طالبان قندھار سے چلے گئے ہیں، اب والی کوٹھی کی عمارت ان کے بجائے ان کے دشمنوں کے قبضے میں ہے اور شہر کی سڑکوں پر اب طالبان کے بجائے امریکی فوجیں گشت کرتی ہیں۔ ان اطلاعات نے ہم سب پر بجلیاں گرائیں، دل خون کے آنسو روئے اور آنکھیں نم ہو گئیں مگر مجھے یقین ہے اور بھرپور یقین ہے کہ وہ مردِ درویش آج بھی بالکل ویسے ہی سنجیدہ اور پروقار شکل وصورت کے ساتھ، سر پر عمامہ رکھے اور سادہ لباس پہنے افغانستان کے کسی پہاڑ یا صحراء میں ویسے ہی سکون اور اطمینان سے بیٹھا ہو گا جیسا ہم نے اسے والی کوٹھی میں بیٹھا دیکھا تھا، کیونکہ وہ زمین کے ٹکڑوں اور انسانوں کے سروں پر نہیں، بلکہ دلوں پر حکمرانی کرتا ہے اور اس کی یہ حکمرانی آج بھی باقی ہے۔ اس کے ساتھی آج بھی اُسے ایک قابلِ فخر امیر سمجھتے ہیں۔ ہزاروں نہیں لاکھوں افغان عوام اس کی راہیں تک رہے ہیں اور کروڑوں مسلمانوں کے دل صبح وشام اس کے لیے دھڑکتے ہیں۔

چھ سو شمارے ہو گئے

دیکھنے والے اثر مبہوت سارے ہو گئے
''بچوں کا اسلام'' کے چھ سو شمارے ہو گئے

خواب میں تقسیم شادی کے چھوارے ہو گئے
جب کھلی آنکھیں تو بالآخر کنوارے ہو گئے

''بچوں کا اسلام'' دریائے ادب پر چھا گیا
اور بچوں کے رسائل اک کنارے ہو گئے

جو منور ہو گئے خود آفتابِ علم سے
امی ابو کی وہ آنکھوں کے ستارے ہو گئے

آپ سے آدھا سپارہ بھی نہیں ہوتا ہے یاد
حافظوں کو حفظ کیسے تیس پارے ہو گئے

پیارے بچے یہ خبر سن کر ہوئے غمگیں بہت
اشتیاق احمد کے بھائی رب کو پیارے ہو گئے

شوقِ عقبیٰ میں بنایا نیکیوں کا اک پہاڑ
اشتیاق احمد کے تو وارے نیارے ہو گئے

جون پوری پر نہ لیکن ہو سکا کوئی اثر
بے عمل، غفلت زدہ سستی کے مارے ہو گئے

اثر جونپوری

کس قیامت کے یہ پرچے مرے نام آئے

پروفیسر محمد اسلم بیگ۔ اسلام آباد

''بنارس نے مجھ پر پرچہ کرا دیا ہے ماسٹر صاحب! پولیس مجھے تلاش کر رہی ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔''

''تم دفتر میں جا کر بیٹھو۔ پریشان نہیں ہونا۔ میں وہیں آتا ہوں۔''

ہمارا آخری پیریڈ تھا۔ کھلے میدان میں ہماری کلاس ہو رہی تھی کہ ہمارے ماسٹر صاحب کا ایک سابق طالب علم گھبرایا ہوا آیا اور ماسٹر صاحب سے مدد طلب کی۔ شاید اس لیے کہ تھانیدار صاحب کا بیٹا ماسٹر صاحب کا موجودہ طالب علم تھا اور ہماری کلاس میں ہی پڑھتا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میرے کان ''پرچہ کرانے'' کی اصطلاح سے آشنا ہوئے، ورنہ اب تک ہم طلبا امتحان کے دنوں میں پرچہ حل کرتے تھے اور ہمیں صرف یہی پتا تھا کہ پرچہ حل کیا جاتا ہے۔ میں اُس وقت پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اُس وقت سے لے کر اب تک پرچے کا لفظ ''پرچہ کرانے'' کے علاوہ بھی مختلف معنوں میں استعمال ہوتے ہوئے سنا، لیکن زندگی کا تقریباً ایک تہائی حصہ پرچہ حل کرنے اور پھر باقی تمام حصہ پرچوں پر نمبر لگانے ہی میں گزرا ہے، بلکہ اب ریٹائرمنٹ کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

طالب علمی کے دور میں ہم لوگ جب بھی پرچہ حل کرتے، اسے امتحان سمجھ کر حل کرتے تھے اور سیدھے سیدھے جواب لکھ کر نگران حضرات کے حوالے کر دیا کرتے تھے، لیکن جب سے ہم نے پرچے جانچنے کا کام شروع کیا ہے، اب تک نہ جانے کتنے پرچوں میں اصل سوالوں کے جوابات کے علاوہ مختلف قسم کی اپیلیں، درخواستیں، التجائیں، دعائیں، پھلجھڑیاں اور اشعار بلکہ کارٹون تک دیکھ اور پڑھ چکے ہیں۔

پرچہ حل کرنے کا آغاز عموماً اس شعر سے ہوتا ہے:

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

کسی زمانے میں اس شعر کا بہت سہارا لیا جاتا تھا:

خزانے کی کنجی ترے پاس ہے
اگر پاس کر دے تو کیا بات ہے

چونکہ پرچے پر نام لکھنے کی اجازت نہیں ہوتی، بلکہ صرف رول نمبر لکھا جاتا ہے، اس لیے بعض لڑکے لڑکی بن کر ممتحن خواتین و حضرات کی ہمدردیاں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں، اس مقصد کے لیے وہ عموماً اپنے پرچے کی بسم اللہ یوں کرتے ہیں:

شروع کرتی ہوں اللہ کے نام سے
میری التجائے نگارش یہی ہے
تیرے نام سے ابتدا کر رہی ہوں

جب کرتی ہوں یا کر رہی ہوں والے الفاظ زیادہ خوش خطی سے یا زیادہ نمایاں کر کے لکھے جاتے ہیں تو ہم لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ کون کیا ہے۔

زیادہ اپیلیں اس عذر پر مبنی ہوتی ہیں کہ ''کل میں سخت بیمار رہا۔ امتحان کی تیاری نہ کر سکا۔ اس وقت بھی میں بخار کی حالت میں پرچہ حل کر رہا ہوں اور میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا لکھ رہا ہوں'' اور واقعی یہ اپیل تو بہت اچھی طرح سمجھ میں آ جاتی ہے جب کہ باقی اصل حصہ جو جوابات پر مشتمل ہوتا ہے، وہ مشکل سے ہی سمجھ میں آتا ہے۔ ایک اور بہانہ یہ بنایا جاتا ہے:

''جناب! میں امتحانی مرکز کی طرف آ رہا تھا کہ راستے میں میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ یہ پرچہ میں زخمی حالت میں حل کر رہا ہوں۔''

اور واقعی اُن کے جوابات اتنے زیادہ زخم خوردہ ہوتے ہیں کہ پڑھ کر خون کے آنسو رونے کو دل چاہتا ہے۔

والد یا بیاری والدہ کی بیماری کا عذر تراشا بھی ایک عام معمول ہے۔

''سر! میں ساری رات اپنی بیمار والدہ کی تیمارداری کرتا رہا ہوں جو ہسپتال میں داخل ہیں۔ اس وقت میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہیں۔ آپ کی پیاری والدہ محترمہ کا واسطہ آپ مجھے پاس کر دیجیے۔''

ایک مرتبہ ایک دلچسپ اپیل پڑھنے کو ملی:

''سر یا میڈم! آپ جو بھی ہیں نگران صاحبہ نے مجھے آدھ گھنٹے بعد پرچہ حل کرنے کے لیے دیا۔ اُن کے ریکارڈ میں میری جو تصویر ہے، میری شکل اُس تصویر سے نہیں مل رہی تھی۔ دراصل میں نے وہ تصویر بیوٹی پارلر سے آنے کے بعد کھنچوائی تھی۔ آج تو میں جلدی میں اسی طرح پرچہ دینے چلی آئی۔ اب آپ ہی بتائیں، اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

ایک اور دلچسپ آغاز:

''میں وہی ہوں پچھلے سال والی۔ آپ نے مجھے پچھلے سال فیل کر دیا تھا، حالانکہ میں نے آپ سے پاس کرنے کی درخواست کی تھی۔ اگر آپ نے اس مرتبہ بھی مجھے فیل کر دیا تو اگلے سال میں پھر آپ کو تنگ کروں گی۔''

بی اے کی ایک طالبہ نے بڑی دردمندانہ اپیل تحریر کی:

''میں تین سال سے امتحان دے رہی ہوں۔ یہ میرا آخری چانس ہے۔ اگر میں اس بار بھی فیل ہو گئی تو میری شادی رُک جائے گی۔ آپ مجھے اپنی بیٹی سمجھ کر پاس کر دیں۔ ساری عمر آپ کو دعائیں دوں گی۔''

کہیں شادی نہ ہونے کا خطرہ ہے تو کہیں شادی ہونے کا دھڑکا۔ ایک اور دلچسپ انداز ملاحظہ کیجیے:

''میرے گھر والوں نے کہا ہے کہ اگر تم فیل ہو گئیں تو تمہاری شادی کر دیں گی جب کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی، بلکہ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ مہربانی فرما کر مجھے پاس کر دیں، تاکہ میں مزید پڑھائی کر سکوں۔''

موبائل فون نمبر درج کرنے کا رواج بھی عام ہے۔ دولت مند والدین کے بیٹے عموماً اس طریقۂ واردات سے کام لیتے ہوئے رابطہ کرنے کی اپیل کرتے ہیں۔ مقصد ''ٹِک مُکا'' ہی ہوتا ہے۔ ''آپ ہمارے کام آئیں۔ ہم آپ کے کام آئیں گے۔''

معذرت

گذشتہ شمارہ 595 میں شائع ہونے والی کہانی ''شریف مرد'' سید بلال پاشا واہ کینٹ کے نام سے شائع ہوئی جب کہ یہ کہانی ف ح کراچی نے ارسال کی تھی۔ اس سلسلے میں سید بلال پاشا اور ف ح کراچی کو پریشانی ہوئی۔ ادارہ معذرت خواہ ہے۔ شکریہ!

ف ح کراچی کی اس کہانی کے بارے میں ایک اور قسم کے خطوط بھی مل رہے ہیں۔ اس کا فیصلہ بعد میں کیا جائے گا۔ **(مدیر)**

ایک موبائل نمبر کے ساتھ یہ اپیل درج تھی:

''میں ایک یتیم اور غریب لڑکا ہوں۔ میرے باقی پرچے بہت اچھے ہوگئے ہیں۔ فرسٹ ڈویژن کی امید ہے۔ صرف یہ پرچہ اچھا نہیں ہوا، کیونکہ آج میری رات کی بھی ڈیوٹی تھی۔ کل دن بھر بھی ڈیوٹی دی۔ غریب کے لیے روٹی کمانا بہت مشکل کام ہے۔ مجھ پر رحم کھائیں اور مجھے اچھے نمبروں سے پاس کر دیں، تاکہ میری فرسٹ ڈویژن آجائے۔ اگر میری طرف سے کسی خدمت کی ضرورت ہو تو اس موبائل نمبر پر رابطہ کرلیں۔''

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ یتیم اور غریب بے چارا کیا خدمت کرے گا۔ خدمت کرنا تو بڑے بڑے خادموں کا کام ہے جو پیسے اور عہدے والے ہوتے ہیں۔ میں نے کبھی کسی امیدوار کی اپیل کے جواب میں اس سے رابطہ نہیں کیا تھا، لیکن نہ جانے کیوں خیال آیا کہ ذرا ان یتیم کو اور غریب طالب علم سے اظہارِ ہمدردی ہی کرلیا جائے۔ اس لیے دیے گئے نمبر پر فون کیا۔ کافی دیر گھنٹی بجتی رہی۔ آخر کار کسی نے بٹن دبایا۔ کسی بڑی عمر والے کی آواز تھی۔ طالب علم کا نام معلوم نہیں تھا، اس لیے میں نے پوچھا:

''صاحبزادے کہاں ہیں؟''

دوسری طرف سے جواب ملا:

''ہاں واقعی صاحبزادے ہی ہیں۔ ان کے دو ہی کام ہیں۔ پیٹ بھر کر کھانا اور جی بھر کے سونا۔ کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے۔ آپ کو ان کے خراٹوں کی آواز نہیں آرہی؟''

''لیکن موصوف فرسٹ ڈویژن کیسے لے لیتے ہیں؟''

''کیا خوب کہی آپ نے! فرسٹ ڈویژن شاید زیادہ کھانے یا زیادہ سونے کے مقابلوں میں ہی لیتے ہوں گے۔ صاحبزادے تین سال سے باقاعدگی سے فیل ہو رہے ہیں۔ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوتے ہیں؟''

ڈبل ڈیوٹی دینے والے یتیم اور غریب صاحبزادے کے والد صاحب کی اتنی گفتگو ہی سے کافی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ اس لیے میں نے فون بند کرنے میں ہی عافیت جانی اور آیندہ اس قسم کا فون کرنے سے توبہ کی۔ کافی عرصہ ہوا ایک پرچے کا آغاز ان الفاظ سے ہوا:

''ٹھہریے! کیا آپ کی اپنی بیوی یا اپنے میاں سے تازہ تازہ لڑائی تو نہیں ہوئی؟ اگر ایسی بات ہے تو مہربانی فرما کر میرا پرچہ ابھی چیک نہ کریں، کیونکہ ہمارے ابو امی کی لڑائی ہوتی ہے تو غصہ ہم بچوں پر ہی نکلتا ہے۔''

امیدوار کو کوئی کیسے بتاتا کہ اُس وقت اُس کے اس ممتحن کی شادی ہی نہیں ہوئی تھی، اس لیے اسے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا، لیکن شاید امیدوار ''دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پینے کا عادی تھا۔

ایک طالب علم نے صرف ایک ہی سوال حل کیا تھا۔ باقی پورا پرچہ خالی تھا، البتہ اُس ایک سوال کے آخر میں یہ تحریر تھی:

''سر! میں نے بازار سے دو سو روپے کا شوئر شاٹ گیس پیچ خریدا۔ اُس میں سے صرف ایک سوال ہی آیا جو میں نے حل کر دیا ہے۔ مہربانی فرما کر اس سوال کے نمبروں کو اوسط قرار دے کر باقی سوالوں کے نمبر بھی دے دیں۔''

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

گویا گیس کی نمی ہی کم تھی، ورنہ موصوف اپنے زرخیز دماغ کو استعمال کر کے باقی سوالوں میں بھی اسی طرح گل کھلا سکتے تھے۔ لہٰذا حاصل کردہ دس نمبروں کو پانچ سے ضرب دے کر پچاس نمبروں کے اپنے آپ کو مستحق سمجھ رہے تھے۔

ایک اور طالب علم نے اُلٹا (باقی صفحہ 24 پر)

دینی وعصری تعلیمی اداروں کے لیے خالصتاً اسلامی بنیادوں پر نصابی کتب شائع کرنے والا واحد اشاعتی ادارہ

اقرأ پبلیکیشنز (رجسٹرڈ)

پسند فرمودہ: خطیب حرم حضرت مولانا محمد مکی صاحب الحجازی (مسجد حرام مکہ مکرمہ)

زیر نگرانی: محمد جمیل رحمانی (صدر مؤسس اقرأ تحریک المدارس پاکستان)

اقرأ پبلی کیشنز کا مکمل نصاب اختیار کرنے والے اداروں کو سہ ماہی سلیبس اور (پرنٹڈ) امتحانی پرچہ جات بھی فراہم کیے جاتے ہیں۔
نیز زیرِ تعلیم طلبہ میں سے 5 فی صد مستحق طلبہ کے لیے کاپی، کتابیں اور یونیفارم وغیرہ مفت فراہم کی جاتی ہیں۔

اقرأ پبلی کیشنز کی مطبوعات کے لیے اچھی شہرت کے حامل اسٹاکسٹ بھی رابطہ کر سکتے ہیں

اقرأ روضۃ الاطفال اکیڈمی (نزد کمیٹی چوک) مری روڈ راولپنڈی (0300-5511471)

اسلامی اسکولنگ کا ملک بھر میں سب سے وسیع و مربوط نیٹ ورک

اقرأ اسکولز موومنٹ (رجسٹرڈ)

اپنے علاقوں میں اسلامی طرز کے اسکول کھولیے اور باوقار ذریعہ معاش کے ساتھ ساتھ اسلامی نظامِ تعلیم کو فروغ دیجیے۔
معلومات اور مکمل رہنمائی (فرنچائزڈ) کے لیے رابطہ کریں: 0301-5373303, 0300-5511471

اصلی ''اقرأ'' کی پہچان: نام بھی اقرأ | یونیفارم بھی اقرأ | نظام بھی اقرأ | نصاب بھی اقرأ

داستان زندگی کی

سارہ الیاس۔ ڈیرہ غازی خان

ہماری اس کہانی کے کردار ہیں قاضی، ابا کے دوست کے صاحب زادے اور خود کو ہمارا دوست خیال کرتے ہیں۔ ایک کردار میں خود ہوں۔ ایک معمولی سا ڈاکٹر اور تیسرا کردار ہے ناہید (نہ جانے کون) یہ تو تھے مرکزی کردار باقی اضافی کرداروں کا ساتھ ساتھ تعارف کروادوں گا۔

ہاں تو جی! اب قاضی صاحب خود کو ہمارا دوست سمجھتے ہیں، چنانچہ ان کا یہ حق ہے کہ وہ صبح سے لے کر شام تک (بلکہ دل ہو تو رات گئے تک) میرے کلینک پر بیٹھے رہیں۔ اسی طرح ناہید بی بی! اللہ جانے کون ہیں کہاں سے آتی ہیں، ہر روز آجاتی ہیں، کبھی پیٹ میں درد ہے، کبھی زکام ہو گیا، ایک دن سانس چڑھ رہے ہیں تو اگلے دن رنگت پیلی پڑ جاتی ہے۔ سچ بتاؤں تو میرا یہ نیا نویلا کلینک (جو چائے کی دکان کو خرید کر بنایا گیا تھا) ابھی دو کے دم سے آباد ہے۔

ناہید تقریباً ساٹھ پینسٹھ سال کی ہے اور قاضی پچھیس کا۔ قاضی بڑی بڑی روشن آنکھوں والا نوجوان ہے تو ناہید اندر دھنسی آنکھوں، جھریوں بھرے چہرے اور نیلے سے ہونٹوں والی بوڑھی (جانے میں ان دونوں کا موازنہ کیوں کرنے لگا ہوں) قاضی ہر وقت سامنے والی کرسی پر اپنے گرد چادر لپیٹے یوں بیٹھا ہوتا ہے جیسے بچپن میں کبھی اپنی دادی کی گود میں بیٹھا کرتا ہوگا۔ چپ چاپ خاموش فلسفی بنا! ہاں ناہید جب آتی ہے، قاضی کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے تو مسکرا پڑتا ہے جیسے سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا ہو، ورنہ سارا سارا دن خاموش بیٹھا میرا اور اکا دکا مریضوں کا معائنہ کرتا رہتا ہے۔ کچھ بولوں بھی تو ہوں ہاں کے سوا کچھ نہیں کہتا اور ناہید! وہ تو جب بھی آتی ہے بول بول کر میرا سر کھاتی ہے۔ یہاں کی بات وہاں کی بات۔ کبھی کبھار تو میں اکتا جاتا ہوں مگر اس کا دم بھی غنیمت ہے۔ خاموش بیٹھے قاضی کو دیکھ دیکھ اور کھیاں مار مار کر بور ہونے سے بہتر ہے، اس کی باتیں ہی سن لی جائیں۔

پتا نہیں ناہید کو قاضی میں کیا نظر آتا ہے، اس کے لیے گاجر کا حلوہ بنا کر لاتی ہے۔ میرے ہی کلینک پر بیٹھ کر اس کے سر پر بادام کے تیل کی مالش کرتی ہے اور قاضی! وہ ناہید کی گود میں سر دیے مسکان ہونٹوں پر سجائے پرسکون سا بیٹھا رہتا ہے۔ عجیب ہیں دونوں بھی نا! مگر ان سے زیادہ عجیب تو میں ہوں۔ روزانہ سوچتا ہوں کہ ان سے کہوں کہ اپنا یہ لاڈ کہیں اور جا کر دکھائیں۔ اتنی ہی پسند ہے بڑھیا تو اسے دادی کے ساتھ گھر ہی رکھ لے مگر پھر خیال آتا ہے کہ قاضی روٹھ نہ جائے۔ وہ ناراض ہو گیا تو میرا کیا بنے گا۔ سارا سارا دن تنہا بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ بندہ کسی سے بات ہی کرے، چاہے وہ آپ کی ہر بات کا جواب ہاں ہوں ہی میں دے اور اس کا پاگلوں کی طرح خلاؤں میں گھورتے رہنا آپ کو کتنا ہی تنگ کیوں نہ کرے۔

شہر سے دور گاؤں میں کلینک ابا کی ضد پر کھولا تھا۔ کچھ خیال یہ بھی تھا کہ یہاں نہ ہسپتال ہے نہ ڈاکٹر، خوب چلے گا مگر ہوا کچھ یوں کہ ساری امیدوں پر پانی

پھر گیا۔ حکیموں اور جعلی ڈاکٹروں کا اتنا دور دورہ تھا کہ مجھ معصوم کو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ ابا کے حکم پر آبائی گاؤں میں میں نے وہ کلینک بنا تو لیا تھا مگر دل یہ کرتا تھا کہ باہر یہ بورڈ لگا کر یہاں سے کوچ کر جاؤں۔

جو بیچتے تھے دوائے دل، دکان اپنی بڑھا گئے

مگر پھر یہ سوچتا ہوں کہ قاضی کا کیا ہوگا۔ جانے کس بات پر ماں باپ سے روٹھ بیٹھا ہے۔ ہزار دفعہ پوچھا، مگر مجال ہے منہ سے کچھ پھوٹے۔ بہت زور دو تو ناراض نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہہ دیتا ہے ''امی کو میرا کسی سے ملنا پسند نہیں تھا'' آپ لاکھ پوچھ لیجیے۔ کس سے ملنا پسند نہیں تھا، جواب نہیں دے گا۔

اس دن نہ تو قاضی آیا اور نہ ناہید۔ شام کے پانچ بج گئے۔ صبح کے اخبار کو 4 بار پڑھ چکا تھا۔ ''اونہہ سیاسی اکھاڑ پچھاڑ مار دھاڑ اور قتل و غارت'' میں واپسی کا سوچ رہا تھا کہ فضاء میں زنگ آلود چین والی قاضی کی سائیکل (اگر میں بطرس ہوتا تو ضرور اس کے ''قصائد'' بیان کرتا) کی بھدی آواز گونجی۔ وہ چپ چاپ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گیا۔ ناہید بھی اس کے پیچھے اندر آئی۔ اپنا نیشنل کاک برقع اتار کر ایک طرف ڈالا اور پنکھے کے سامنے ٹھہر کر ''سی سی، بڑی گرمی ہے'' کرنے لگی۔

''یار ڈاکٹر (قاضی اور ناہید مجھے ڈاکٹر کہتے ہیں) یہ! یہ رپورٹس دیکھ ذرا! ماں کی'' قاضی بولا تھا۔ میں لے کر دیکھنے لگا۔ ''اوہ! انھیں تو'' میں ناہید کو متوجہ پا کر ایک دم چپ ہو گیا۔ وہ میرے رازدارانہ انداز پر کھوکھلی ہنس کر بولی:

''کملے! میں جانتی ہوں کینسر ہے مجھے، دو، ایک ماہ کی مہمان ہوں میں۔''

اس کا لہجہ کسی بھی تاثر سے عاری تھا۔

''مگر یار قاضی!'' خواہ مخواہ ہی میرا گلا رندھ گیا اور وہ چپ چاپ بے حس و حرکت پتھر کا بت بن کر بیٹھا رہا۔

''پتر ڈاکدار! میرے مرن تے توں وی روئے گا ناں؟'' لفظ لفظ میں نوحہ سمویا ہوا تھا۔

''کیسی بات کرتی ہو؟ تیرا علاج کروائیں گے، تو بھلی چنگی ہو جائے گی۔'' میں نے کہا تو وہ بولی۔

''نہ پتر! جی کے کی کرنا ہے، بس توں رونا ضرور، دعا دی کرنا۔'' بڑی حسرت تھی اس کے لہجے میں۔

''یار! ہم لوگ کیا کر سکیں گے جب سے کینسر کا پتا چلا ہے، ان کے بیٹے اور بہو نے گھر سے نکال دیا ہے۔ مہنگی بیماری ہے نا۔''

''جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔'' یہ قاضی بولا تھا۔

پھر ہم دونوں نے خوب دوڑ دھوپ کی۔ ناہید کو شوکت خانم ہاسپٹل میں داخل کرایا کچھ بہتر بھی لگنے لگی۔ شاید زندگی بچانے والی ادویات کے اثرات تھے۔ رپورٹس حوصلہ افزاء نہیں تھیں۔ کینسر کی آخری سٹیج، چراغ سحری بس بجھا چاہتا تھا اور میں اور قاضی بس اسے بجھتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ کئی بار کہا کہ اس کے اکلوتے بیٹے کو اطلاع کر دو، مگر قاضی لب بھینچ کر کھڑا ہو جاتا۔ ''جو کرنا ہے ہمیں کرنا ہے سمجھے؟'' وہ کہتا۔

ایک ڈیڑھ ماہ گزر گیا۔ ایک سرد دوپہر قاضی حسب عادت چپ چاپ اپنی کرسی پر مٹی کا مادھو بن کر براجمان ہو گیا۔ میں نے پوچھا: ''یار قاضی! اماں کو اکیلا چھوڑ آئے ہو؟''

''نہیں! وہ مجھے اکیلا چھوڑ گئی ہیں۔''

''قاضی!'' میرے منہ سے نکلا۔

''اماں فوت ہو گئیں۔''

''نن... نہیں۔''

''نہیں یار! مرتو وہ اس دن گئی تھی جب اس کے اکلوتے بیٹے نے اسے گھر سے نکالا تھا۔ اب تو بس مجھے تنہا کر گئی ہے۔'' وہ رونے لگا۔ مجھے اس طرح رونا کچھ پسند نہ آیا۔

''یار! رونا بند کر! اس کے گھر والوں کا اتا پتا ہے؟ خبر کریں۔''

''ہاں ہے اتا پتا!'' غصے سے پھٹتی آواز میں وہ چلایا تھا۔ ''اس کی آخری خواہش بھی یہی تھی کہ بیٹا ضرور کندھا دے۔ چل اٹھ چل میرے گھر! سنا آئیں خوش خبری اماں ابا کو۔ کہہ آئیں کہ خوشیاں منائیں، چراغاں کریں، جشن منائیں، مر گئی بوڑھی دادی، چھٹکارہ مل گیا۔ بیماری پر تو خرچ کیا نہیں، اب موت کی رسوم پر کر لیں، برادری میں نام کا مسئلہ ہے نا! آہ! کون اب قاضی کو گاجر کا حلوہ کھلائے گا، کون میرے سر میں تیل ڈالے گا، ہائے ہائے۔'' وہ مارے دکھ کے دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا اور میں حیرت زدہ تھا کہ اتنے امیر کبیر چوہدری افضل قاضی کے پاس ماں پر خرچ کرنے کو بھی رقم نہیں تھی۔ وہ تو شاید خود بھی ایم بی بی ایس تھے، تبھی یہ دادی پوتا یہاں گاؤں آ گئے ہوں گے۔

آج 35 سال بعد میں ملک کا مشہور آنکولوجسٹ ہوں۔ شوکت خانم وارڈ نمبر 10 بستر نمبر 30 پر لاچار پڑے انکل افضل اور ان کے پوتے کو دیکھ رہا ہوں۔ قاضی باپ کو یہاں داخل تو کروا گیا تھا مگر اس نے پلٹ کر حال نہیں پوچھا تھا ان کا۔ البتہ پوتا سارا دن یہیں لگا رہتا ہے۔ میں دادا پوتا کو دیکھ رہا ہوں۔ ان دونوں کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور آنکھیں نم تو میری بھی ہو گئی ہیں۔ یہ سوچ کر کہ:

جانے زندگی کیا ہے، مفلس کی قبا کہ دھنک رنگ آنچل، دیوانے کا خواب یا سیانے کی تدبیر۔

عطاء اللہ شاہ بُخاری کی ذہانت

ایک مرتبہ حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کو ڈیرہ غازی خان جانا ہوا۔ ملتان ڈیرہ اڈا پہنچ کر انھیں یاد آیا کہ بٹوہ تو وہ گھر چارپائی پر بھول آئے ہیں۔ گاڑی اڈے پر بالکل تیار کھڑی تھی اور چند منٹ میں نکلنے والی تھی۔ حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ نے سوچا کہ اگر بٹوہ اٹھانے گھر واپس جاتا ہوں تو گاڑی نکل جائے گی اور دوسری گاڑی میں جانے سے دیر ہو جائے گی۔ انھوں نے سامنے دیکھا تو ایک دکان کھلی ہوئی تھی، کیونکہ ابھی صبح کا وقت تھا۔ باقی دکانیں بند تھیں۔ وہ دکان پر گئے۔ دکان کا مالک صفائی میں مصروف تھا۔ حضرت شاہ جی اپنے ہاتھ میں اکثر موٹا ڈنڈا اٹھائے رہتے تھے۔ انھوں نے وہ ڈنڈہ دکان کے سامنے رکھے ہوئے بینچ پر زور سے مارا اور رعب دار آواز میں کہا، دس روپے نکالو، دکان دار نے فوراً نکال کر دے دیے۔ اس دن تو وہ ڈیرہ غازی خان چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد دس روپے واپس کرنے کی غرض سے وہ دوبارہ دکان پر گئے۔ دکان دار انھیں دیکھ کر سہم گیا اور بولا بابا پھر آ گیا۔ اتفاق سے اس دن دکان کے سامنے کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ حضرت شاہ جی کو جانتے تھے۔ انھوں نے کھڑے ہو کر حضرت شاہ جی کو سلام کیا۔ حضرت شاہ جی نے اس دن والا واقعہ سنایا تو وہ بہت ہنسے۔ دکان دار یہ سن کر بہت شرمندہ ہوا اور دس روپے لینے سے انکار کر دیا مگر بعد میں شاہ جی کے اصرار پر لے لیے۔

محمد فیصل حبیب۔ مہند شریف

واقعاتِ صحابہ

عبداللہ فارانی

90

ایک روز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے سامنے بیان فرمایا۔ پہلے اللہ کی حمد وثنا بیان فرمائی۔ اس کے بعد فرمایا:

"مجھے یہ خبر ملی ہے کہ کچھ لوگ مجھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے افضل قرار دیتے ہیں۔ اگر میں اس بات سے پہلے ہی وضاحت کے ساتھ منع کر چکا ہوتا تو اس پر ان لوگوں کو ضرور سزا دیتا، کیونکہ میں اسے پسند نہیں کرتا کہ میں نے جس کام سے ابھی روکا نہ ہو، اس پر کسی کو سزا دوں، لہٰذا میرے آج کے اس اعلان کے بعد اگر کسی نے ایسی بات کہی تو وہ بہتان باندھنے والا شمار ہوگا اور اسے بہتان باندھنے والے کی سزا ملے گی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہترین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں، ان کے بعد تو ہم نے کئی نئے کام ایسے شروع کر دیے ہیں جن کے بارے میں اللہ ہی فیصلہ کرے گا کہ وہ صحیح ہیں یا غلط۔" (ابنِ ابی عاصم۔ ابن عساکر)

O

حضرت سوید بن غفلہ رحمہ اللہ کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے۔ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ذکر کر رہے تھے۔ ان دونوں کے درجے کو گھٹا رہے تھے۔ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جا کر یہ ساری بات بتائی۔ آپ نے سنتے ہی فرمایا:

"اللہ اس پر لعنت کرے جو اپنے دل میں ان دونوں حضرات کے بارے میں اچھے اور نیک جذبات کے علاوہ کچھ اور رکھے۔ یہ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی اور آپ کے وزیر تھے۔"

اس کے بعد آپ منبر پر تشریف لے گئے اور لوگوں کے سامنے فرمایا:

"لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ قریش کے دو سرداروں اور مسلمانوں کے دو باپوں کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہیں جن سے میں بیزار ہوں اور بری ہوں بلکہ انھوں نے جو غلط باتیں کی ہیں، ان پر سزا ضرور دوں گا ... اس ذات کی قسم! جس نے دانے کو پھاڑا ... اور جان کو پیدا فرمایا ... ان دونوں سے صرف وہی محبت کرے گا جو مومن اور متقی ہوگا اور ان دونوں سے وہی بغض رکھے گا جو بدکار اور خراب ہوگا ... یہ دونوں حضرات سچائی اور وفاداری کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے ... دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نیکی کا حکم فرمایا کرتے تھے اور برائی سے روکا کرتے تھے اور سزا دیا کرتے تھے ... جو کچھ بھی کرتے تھے ... اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے مبارک کے خلاف کچھ بھی نہیں کیا کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی کسی کی رائے کو ان دونوں کی رائے جتنا نہیں سمجھتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں سے جتنی محبت تھی، اتنی کسی اور سے نہیں تھی، حضور دنیا سے تشریف لے گئے تو ان دونوں سے بالکل راضی تھے اور اس زمانے کے تمام لوگ بھی ان سے راضی تھے ... پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری دنوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نماز کی ذمے داری دی گئی ... پھر جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اٹھا لیا تو مسلمانوں نے ان پر نماز کی ذمے داری کو برقرار رکھا، بلکہ ان پر زکوٰۃ کی ذمے داری بھی ڈال دی، کیونکہ قرآن میں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر اکٹھا ہی آیا ہے ... بنو عبدالمطلب میں سے سب سے پہلے ان کا نام خلافت کے لیے پیش کرنے والا میں تھا ... انھیں تو خلیفہ بننا سب سے زیادہ ناگوار تھا ... بلکہ وہ تو چاہتے تھے کہ ہم میں سے کوئی ان کی جگہ خلیفہ بن جائے ... اللہ کی قسم حضور کے بعد جتنے آدمی باقی رہ گئے تھے، وہ ان میں سے سب سے بہترین تھے ... سب سے زیادہ شفیق تھے ... سب سے زیادہ رحم دل اور بڑے عقل مند اور پرہیزگار انسان اور سب سے پہلے اسلام لانے والے تھے ...

قدم بہ قدم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں شفقت اور رحم دلی میں حضرت میکائیل اور معاف کرنے اور وقار سے چلنے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی تھی ... وہ خلیفہ بن کر بالکل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر چلتے رہے ... یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا ... اللہ ان پر رحم فرمائے ... حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے مشورہ کر کے اپنے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا ... کچھ لوگ ان کی خلافت پر راضی تھے ... کچھ راضی نہیں تھے ... میں ان میں سے تھا جو ان کی خلافت پر راضی تھا، لیکن اللہ کی قسم! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسے عمدہ طریقے سے خلافت کا کام سنبھالا کہ ان کے دنیا سے جانے سے پہلے وہ سب لوگ بھی ان سے راضی ہو چکے تھے جو شروع میں راضی نہیں تھے اور انھوں نے خلافت کے کام کو بالکل حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے طریقے پر چلایا ... وہ ان دونوں حضرات کے نشانِ قدم پر اس طرح چلے ... جس طرح اونٹ کا بچہ اپنی ماں کے نقشِ قدم پر چلتا ہے اور اللہ کی قسم! وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد رہ جانے والوں میں سب سے بہترین تھے اور بڑے مہربان تھے اور رحم دل تھے ... ظالم کے خلاف مظلوم کی مدد کیا کرتے تھے ... پھر اللہ تعالیٰ نے حق کو ان کی زبان پر اس طرح جاری کر دیا تھا کہ ہمیں محسوس ہوتا تھا کہ فرشتہ ان کی زبان پر بول رہا ہے ... ان کے اسلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت عطا فرمائی ... اور ان کی ہجرت کو دین کے قائم ہونے کا ذریعہ بنایا اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے دل میں ان کی محبت اور منافقوں کے دل میں ان کی ہیبت ڈالی ہوئی تھی ... اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دشمنوں کے بارے میں سخت دل اور سخت کلام ہونے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ اور کافروں پر دانت پیسنے اور سخت ناراض ہونے میں حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی تھی ... اب بتاؤ، تمھیں کون، ان جیسا لا کر دے سکتا ہے، ان دونوں کے درجے کو وہی پہنچ سکتا ہے جو ان سے محبت کرے گا اور ان کی پیروی کرے گا اور جو ان دونوں سے محبت کرے گا، وہ مجھ سے محبت کرنے والا ہے اور جو ان سے بغض رکھے گا، وہ مجھ سے بغض رکھنے والا ہے ... اور میں اس سے بری ہوں، لوگو! اگر میں ان دونوں حضرات کے بارے میں یہ باتیں پہلے کہہ چکا ہوتا تو میں ان کے خلاف بولنے والوں کو آج سخت سے سخت سزا دیتا، لہٰذا میرے آج کے اس بیان کے بعد جو اس جرم میں پکڑ کر میرے پاس لایا جائے گا، میں اسے وہ سزا دوں گا جو بہتان باندھنے والے کی سزا ہوتی ہے ... غور سے سن لو، اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے پہلے بہترین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر اللہ ہی جانتے ہیں کہ خیر اور بہتری کہاں ہے ... میں اپنی یہ بات ختم کرتا ہوں ... اللہ میری اور تم سب کی مغفرت

فرمائے۔" (کنز العمال 460/4)

○

ایک آدمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا:

"حضرت عثمان رضی اللہ عنہ (نعوذ باللہ) جہنم میں ہیں۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا:

"تمھیں اس بات کا پتا کیسے چلا۔"

اس نے جواب دیا:

"اس لیے کہ انھوں نے بہت سے غلط کام کیے۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا:

"اگر تمہاری کوئی بیٹی ہو تو کیا تم اس کی شادی بغیر مشورے کے کر دو گے۔"

اس نے کہا: "نہیں!"

اب آپ نے فرمایا:

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی دو بیٹیوں کی شادی کے بارے میں جو رائے تھی، کیا اس سے بہتر کوئی رائے ہو سکتی ہے ... ذرا مجھے بتاؤ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کام کا ارادہ فرماتے تھے، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتے تھے یا نہیں۔"

اس نے کہا:

"کیوں نہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم استخارہ کرتے تھے۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا:

"اچھا یہ بتاؤ... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو بیٹیوں کی جو شادی کی تھی تو اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے خیر کا انتخاب کیا تھا یا نہیں ... سنو! میں نے تمہاری گردن اڑا دینے کے بارے میں غور کیا تھا، لیکن ابھی اللہ کو منظور نہیں تھا... غور سے سنو! اگر تم اس کے علاوہ کچھ اور کہو گے تو میں تمہاری گردن اڑا دوں گا۔"

○

حضرت سعد رضی اللہ عنہ پیدل چلے جا رہے تھے ... راستے میں ایک آدمی ملا... وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی شان میں نامناسب کلمات کہہ رہا تھا... حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا:

"تم ایسے لوگوں کو برا کہہ رہے ہو جنھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت سے فضائل اور انعامات مل چکے ہیں۔ اللہ کی قسم! یا تو تم انھیں برا کہنا چھوڑ دو، ورنہ میں تمہارے لیے بددعا کروں گا۔"

اس شخص نے جواب میں کہا:

"یہ شخص مجھے ایسے ڈرا رہے ہیں جیسے کہ یہ نبی ہوں۔"

اس پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ دعا فرمائی:

"اے اللہ! اگر یہ ان لوگوں کو برا کہہ رہا ہے جنھیں تیری طرف سے بہت سے فضائل اور انعامات مل چکے ہیں تو تو اسے عبرت ناک سزا دے۔"

اسی وقت ایک بختی اونٹنی تیزی سے اس طرف آئی۔ لوگ اسے دیکھ کر ادھر اُدھر ہٹ گئے۔ اس اونٹنی نے اس شخص کو پیروں کے نیچے کچل کر مار ڈالا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ وہاں سے چل پڑے تو لوگ پیچھے پیچھے چلنے لگے، وہ کہہ رہے تھے:

"اے ابو اسحٰق! اللہ نے آپ کی دعا قبول کر لی۔"

○

حضرت قیس بن ابی حازم رحمہ اللہ مدینہ منورہ کے ایک بازار میں چلے جا رہے تھے۔ ایک جگہ انھوں نے بہت سے لوگوں کو جمع دیکھا۔ ان کے درمیان ایک آدمی سواری پر بیٹھا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا کہہ رہا تھا۔ ایسے میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ وہاں آ گئے۔ انھوں نے پوچھا:

"یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

لوگوں نے انھیں بتایا:

"سواری پر سوار شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا کہہ رہا ہے۔"

یہ سن کر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ آگے بڑھے۔ لوگوں نے انھیں راستہ دے دیا۔ آپ نے اس آدمی کے نزدیک جا کر فرمایا:

"او فلاں! تو کس وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا کہہ رہا ہے۔ کیا وہ سب سے پہلے مسلمان نہیں ہوئے۔ کیا انھوں نے سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز نہیں پڑھی۔ کیا وہ لوگوں میں سب سے بڑے زاہد اور سب سے بڑے عالم نہیں تھے۔"

آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اور بھی بہت سے فضائل بیان کیے اور یہ بھی کہا:

"کیا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد نہیں تھے۔ کیا غزوات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا ان کے ہاتھ میں نہیں ہوتا تھا۔"

یہ فرمانے کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے قبلے کی طرف منہ کر کے یہ دعا مانگی:

"اے اللہ! اگر یہ آدمی تیرے ایک دوست کو برا کہہ رہا ہے تو ان لوگوں کے چلے جانے سے پہلے انھیں اپنی قدرت دکھا دے۔"

اللہ کی قدرت کہ سب لوگ ابھی وہیں تھے کہ اس شخص کی سواری کے پاؤں زمین میں دھنسنے لگے۔ اس سے وہ سر کے بل نیچے گرا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور اس کا بھیجا باہر نکل آیا۔ (حاکم 500/3) (جاری ہے)

آئینے کے پیچھے

فوزیہ خلیل۔ کراچی

مجھے یاد ہے، میرے والد کو جاسوسی کی غرض سے جب اسلامی ملک میں بھیجا گیا تو اُس وقت میں بہت چھوٹا تھا مگر میرا بڑا بھائی فلنطوف تو خاصا سمجھ دار تھا۔ ہم لوگ اسرائیل سے یہاں آئے تھے۔ کٹر یہودی گھرانے سے ہمارا تعلق تھا۔ ابو نے یہاں آکر مسلمانوں والی وضع قطع اختیار کر لی تھی۔ امی کو پردہ کرانا شروع کر دیا۔ مجھے اور فلنطوف کو مدرسوں میں داخل کرادیا جب کہ اسرائیل میں، میں اور فلنطوف ایک بہترین یہودی اسکول میں پڑھتے تھے:

''یاد رکھنا! تم دونوں یہودی ہو۔ ایک کٹر یہودی والدین کی اولاد۔ ہم لوگوں کو ہمارے وطن اسرائیل نے یہاں پر، اس اسلامی ملک میں جاسوسی کرنے اور سازشیں کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ تمہاری امی کو پردہ کرانا اور تم دونوں بھائیوں کو اسلامی مدرسوں میں پڑھانا، ہمارے منصوبے کا حصہ ہے۔ یہاں سب پر یہی ظاہر کرنا ہے کہ ہم سب بہترین مسلمان ہیں مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ جب ہم اپنے حصے کا کام مکمل کر لیں گے تو ہمارا وطن ہمیں واپس بلالے گا مگر اس میں برسوں لگیں گے۔''

مدرسے میں داخلے کے وقت ابو ہم دونوں کو تفصیل سے ایک ایک بات سمجھا رہے تھے۔

''یہاں پر تم دونوں کا نام آطوف اور فلنطوف نہیں ہے۔ یاد رکھنا! یہاں پر آطوف کا نام عبدالہادی ہے اور فلنطوف کا نام عبدالرحیم ہے۔ مسلمان بچوں سے خوب میل جول بڑھانا۔ اُن میں گھل مل جانا۔ یہاں کی زبان تو میں تم لوگوں کو کافی حد تک سکھا چکا ہوں۔''

''بے فکر رہیں! ڈیڈ! ہم آپ کو شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔'' فلنطوف نے فوراً جواب دیا۔

پتا نہیں فلنطوف کیسا محسوس کر رہا تھا مگر مجھے تو یہ سب بہت ہی عجیب لگ رہا تھا اور پھر برسوں یہاں رہنا۔ میرا چھوٹا سا ذہن یہ سب مشکل سے قبول کر رہا تھا اور پھر ہم نے مدرسہ جانا شروع کر دیا۔ وہاں دینی تعلیم، قرآن اور حدیث کا علم سیکھنے لگے۔

مدرسے میں میرے کئی اچھے اچھے دوست بنے۔ بہت ہی مخلص اور پیار کرنے والے۔ شہیر، بلال وغیرہ۔ یہ ہر کام میں میری مدد کرتے۔ اپنا کھانا بہت محبت سے مجھے کھلاتے۔ میرا نامکمل کام مکمل کروادیتے۔

چار پانچ سال میں، میں خاصا بڑا اور سمجھ دار ہو گیا تھا۔ مولانا محب اللہ سے میں اس حد تک متاثر ہو چکا تھا کہ میرے خیال میں وہ دنیا کے ایک بہترین استاد تھے۔ فلنطوف تو اکثر ہی چھٹی کیا کرتا۔ مدرسے میں اُس کا بڑا ہی دل گھبراتا تھا مگر میں دل کی خوشی سے روزانہ جایا کرتا تھا اور اکثر میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ میں نے ایک سچا مذہب پالیا ہے۔ ایک آفاقی اور عالمگیر مذہب، مجھے خوف محسوس ہونے لگا تھا اپنے گھر والوں سے۔ شہیر مشہود، بلال اور مولانا محب اللہ کے درمیان بیٹھ کر میں ایسا محسوس کرتا جیسے میں دنیا کے بہت ہی پیار کرنے والے سچے رشتوں کے درمیان میں ہوں۔

''عبدالہادی ایک بہت بہترین طالب علم ہے۔ بہترین طالب علم کے ساتھ ساتھ ایک بہترین عملی مسلمان بھی ہے۔'' اُس دن مولانا محب اللہ جماعت میں کہہ رہے تھے تو مجھے بڑا خوف محسوس ہوا۔ کیا میں واقعی عملاً مسلمان ہو چکا تھا؟ امی ابو اور

محبت الٰہیہ کتب کا پیکیج

فقیہ العصر مفتی اعظم حضرت اقدس مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

محبتِ الٰہیہ

صفحات 374

2 عورت کے بندے

3 فتنہ انکار حدیث

4 بدعات مروجہ

5 نماز میں مردوں کی غفلتیں

6 نفس کے بندے

7 نماز میں خواتین کی غفلتیں

8 اسلام میں ڈاڑھی کا مقام

9 مرض وموت

10 اصلاحِ خلق کا الٰہی نظام

اصل قیمت ~~750/=~~

رعایتی قیمت 450/=

منی آرڈر روانہ فرمائیں ڈاک خرچ مفت

کتاب گھر

السادات سینٹر بالمقابل دارالافتاء والارشاد ناظم آباد نمبر 4، کراچی 75600

فون: 021-36688747,36688239

ایکسٹینشن: 211 موبائل: 0305-2542686

فلنٹوف کو پتا چلا تو کیا ہوگا؟ ایک خوف میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

ابو کا جاسوسی اور سازشی منصوبہ کہاں تک پہنچا تھا، یہ تو مجھے معلوم نہیں تھا، لیکن اب بڑے بڑے فوجی جرنیل وغیرہ سے ہمارے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ ابو کا ان لوگوں میں بڑا اثر رسوخ ہو گیا تھا۔

”مسلمان قوم بڑی دھوکے باز اور چور ہوتی ہے۔ بددیانت بھی اور مکار بھی۔ اپنے وطن کے لیے کبھی مخلص نہیں ہوتی۔ پیسے کے لیے مسلمان قوم اپنا دین ایمان تک بیچ سکتی ہے۔“

ہم لوگ ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے تو ابو نے یہ بات کہی۔ میرے دل کو ایک تکلیف سی ہوئی۔ میں نے منہ میں لے جاتا ہوا نوالہ واپس میز پر رکھ دیا۔

”آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں ڈیڈ!“ فلنٹوف نے فوراً جواب دیا۔

میں خاموش رہا مگر پھر میں ایک لقمہ بھی منہ میں نہ رکھ سکا۔ تھوڑی دیر یونہی میز پر بیٹھا رہا، پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔

”کیا واقعی مسلمان قوم دھوکے باز ہوتی ہے۔ کیا واقعی بددیانت ہوتی ہے۔“ میں سوچنے لگا۔ پھر میرے ذہن میں میرے دوست شہیر، بلال مشہود وغیرہ کا سراپا گھومنے لگا۔ پھر مولانا محب اللہ کی دلکش شخصیت میرے ذہن میں اُتر آئی۔

”جو دھوکے بازی کرتے ہوں گے اور مکاری بھی... وہ کبھی بھی سچے مسلمان نہیں ہو سکتے... ایک سچا مسلمان یہ سب کچھ کبھی نہیں کر سکتا... وہ جان دینا تو پسند کر لے گا مگر اپنا دین ایمان کبھی نہیں بیچ سکتا۔“ میرے ذہن نے جواب دیا۔

”ایک بہت بڑا غبن کرتے ہوئے پکڑے گئے ہیں دو ملزمان۔“ اُس روز فلنٹوف اونچی آواز میں اخبار پڑھ کر سب کو سنا رہا تھا۔

”کون تھے وہ دو ملزمان! یقیناً مسلمان ہوں گے۔“ امی کے لہجے میں طنز تھا، تمسخر تھا، استہزا تھا۔

”ہاں دونوں غبن کرنے والے مسلمان ہیں۔“ فلنٹوف نے زور سے جواب دیا۔

میں بے چین ہو کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ میرا دل چاہا، میں چیخ چیخ کر کہوں۔ نہیں نہیں وہ مسلمان نہیں ہوں گے۔ وہ نام کے مسلمان ہوں گے۔

مجھے معلوم بھی نہ ہوا، میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”تمہیں کیا ہوا آطوف! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے!“ امی نے مجھے دیکھا۔

”میں... میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

☆

”اتنی بڑی چوری! اتنا بڑا گھپلا! میری کمپنی میں۔“ ابو کہہ رہے تھے۔ اُن کی آواز رو رہی تھی۔

”افسوس! میں دیوالیہ ہو گیا۔ میری کمپنی تو ڈوب گئی۔“ وہ بڑے دل گرفتہ تھے۔ انھیں غمگین دیکھ کر ہم بھی بڑے شکستہ دل تھے۔

”مجھے یقین ہے یہ اتنی بڑی چوری کسی تنگ دل مسلمان ہی نے کی ہوگی۔“ وہ سر اٹھا کر بولے۔

”یہ کوئی ضروری تو نہیں۔“ میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

”نہیں یہ ضروری ہے، یہ کوئی مسلمان ہی ہے جو مجھے ہنستے نہیں دیکھ سکتا۔“ وہ بڑے نڈھال نظر آ رہے تھے۔

اور پھر کافی دن گزر گئے۔ میں بہت مصروف رہا۔ فلنٹوف کے اپنے مشاغل تھے۔ اپنے ہی دوست تھے۔

پھر اُس رات میں دبے قدموں ابو کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ سو چکے تھے۔ جب سے اُن کی کمپنی میں خرد برد ہوئی تھی، وہ نیند کی گولیاں لینے لگے تھے۔ میں ابو کے کمرے میں داخل ہوا تو میرے ہاتھ میں ایک بنڈل تھا۔ بنڈل! نوٹوں سے بھرا ہوا اور دوسرے ہاتھ میں ایک خط تھا۔

خط کا مضمون یہ تھا:

پیارے ابو

کاش! وہ وقت آئے کہ آپ کو سلامتی کی دعا دے سکوں۔ السلام علیکم کہہ سکوں! مجھے جلد ہی پتا چل گیا تھا کہ آپ کی کمپنی میں چوری ایک مسلمان نے نہیں کی تھی بلکہ چوری ایک یہودی نے کی تھی اور یہودی بھی کون؟ آپ کا اپنا یہودی بیٹا فلنٹوف!

یہ کچھ رقم ہے۔ اتنی تو نہیں ہے جتنی کہ چرائی گئی ہے مگر اس رقم سے آپ کی کمپنی کو سنبھالا مل جائے گا۔ یہ رقم آپ کے لیے، بہت ہی مشکل سے، کس نے اکٹھی کی ہے۔ آپ کے اپنے مسلمان بیٹے عبدالہادی نے۔ واللہ! اگر میں مسلمان نہ ہوتا تو ایک روپے سے بھی آپ کی مدد نہ کرتا۔ یہ رقم جمع کرنے میں میرے کچھ مسلمان دوستوں نے میری مدد کی ہے۔ یہ نام کے مسلمان نہیں، سچے مسلمان ہیں اور ایک سچا مسلمان اپنے دین کی پاس داری کرتا ہے۔ بدنامی کا سبب نہیں بنتا۔ کاش اللہ رب العزت ہم سب کو سچا مسلمان بنا دے۔ ایسا ہی سچا جسے دیکھ کر غیر مسلموں کے دل بھر جائیں۔

ہدایت کی بہت ساری دعاؤں کے ساتھ

عبدالہادی۔

بچوں کا اسلام کی عدالت

طیبہ انوار صاحب نے لاہور سے ایک کیس بھیجا ہے اور اپنا جج محمد شاہد فاروق صاحب کو بنایا ہے... وہ لکھتی ہیں:

طیبہ انوار: جج صاحب! ہمیں سالنامے میں 52 صفحات کا لالچ دیا گیا... اس میں آٹھ صفحات کے اشتہارات تھے... نیز یہ ہے تو بچوں کا اسلام، چاہے اسے بڑے پڑھیں یا چھوٹے، فرق کیا پڑتا ہے... آخر ان اشتہارات کا بچوں سے کیا تعلق... مثلاً ماوئی ہومز، توفیق اسٹیل، عصرِ شیریں، معمار ٹرسٹ، محافظِ جان، شریعہ اینڈ بزنس... یہ اشتہارات تو اخبار میں ہونے چاہئیں... بہرحال اگر ان اشتہارات کو لگانا ہے تو اضافی صفحات لگائے جائیں... ہمارے 8 صفحات ان اشتہارات کی نذر ہو گئے... ہم یہ زیادتی عام شمارے میں تو برداشت کر لیتے ہیں... لیکن سالنامے میں بالکل بھی نہیں... نہیں... نہیں... یہ صرف میرا ہی نہیں، ہر قاری کا روگ ہے... جج صاحب! ہمیں انصاف چاہیے... انصاف...

مدیر: جج صاحب! اشتہارات کے بارے میں پہلے ہی بہت وضاحتیں کی جا چکی ہیں، پھر اس سالنامے میں تو اشتہارات آٹے میں نمک کے برابر تھے... اس پر بھی شکایت؟

دوسری بات... جن اشتہارات کا تعلق ان کے والدین سے ہے، کیا وہ بچوں کا اسلام نہیں پڑھتے... انھوں نے خود تسلیم کیا ہے کہ بچوں کا اسلام سب پڑھتے ہیں، چاہے وہ چھوٹے ہوں یا بڑے... بس مجھے یہی عرض کرنا تھا:

جج صاحب: طیبہ انوار صاحبہ اور مدیر صاحب کے دلائل کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ اشتہارات کسی بھی رسالے کے لیے آکسیجن کا کام دیتے ہیں، لہٰذا رسالے میں اشتہارات ضرور شامل کیے جائیں... بلکہ عدالت اشتہارات کی تعداد 8 سے بڑھا کر سولہ صفحات تک کرنے کی اجازت دیتی ہے... لیکن عدالت انتظامیہ کو ہدایت کرتی ہے کہ اس کے لیے قارئین کو اگر قیمت میں اضافے کا کڑوا گھونٹ پلایا جائے تو قارئین یہ کڑوا گھونٹ بخوشی پی لیں گے۔

عدالت آئندہ کیس تک برخاست سمجھی جائے۔

زندہ کی موت

حافظ حمزہ شہزاد۔ سرائے سدھو

بتاتا چلوں کہ اشرف ہمارا محلے دار تھا۔ عمر رسیدہ آدمی تھا۔ بے روزگار تھا۔ کمزور سے وجود کا مالک بے ضرر شخص تھا۔ گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ شادی کے دوسرے ماہ ہی اس کی بیوی کو اچانک ہیضہ ہوا اور وہ وفات پا گئی۔ تب سے اشرف اکیلا تھا۔ کبھی کبھار اس کے بھانجے بھانجیاں اسے ملنے آجاتے تو گھر میں رونق ہو جایا کرتی تھی۔ اشرف کا گزارہ محلے والوں کی ''خدا ترسی'' سے بخوبی ہو رہا تھا مگر پھر بھی وہ دغا بازی سے باز نہیں آتا تھا۔ وہ تقریباً آدھے شہر کا مقروض تھا۔ قرض لینے کے لیے ایسا چکر چلاتا کہ دوسرے شخص کو مجبور ہو کر قرض دینا پڑتا تھا۔ اشرف نے مجھ سے بھی تقریباً آٹھ سو روپے قرض لیے ہوئے تھے اور میں اس وقت قرض وصول کرنے کے سلسلے میں ہی اشرف کے پاس موجود اس کی چکنی چپڑی باتیں سننے میں مصروف تھا۔ اسی وقت اس کے گھر کے دروازے پر دستک دی گئی تھی۔

''شہزاد بیٹے! تم دروازے پر دیکھو کہ کون ہے؟''

کسی بھی جرم میں ملوث نہ ہونے کے باوجود اشرف پولیس کے نام سے بری طرح بدک گیا تھا۔ دستک دوبارہ ہوئی۔ اشرف نے مجھے دیکھا۔ میں نے نظریں چرالیں۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ وہ دروازے کے قریب پہنچا اور ہلکی سی درز سے باہر جھانکا اور بری طرح اچھل پڑا۔

''چچا کون ہے؟'' میں بے اختیار پوچھ اٹھا۔

''دھڑ... دھڑ... دھڑا دھڑ دھڑ!'' دروازہ بری طرح پیٹا گیا تھا۔ میں اور اشرف بری طرح چونک گئے۔

''یہ کون بدتمیز ہے۔'' اشرف غصے سے کھڑا ہو گیا۔ اس کا کمزور سا وجود غصے میں کانپتا ہوا کچھ اور کمزور لگنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ غصے کی حالت میں باہر کی طرف لپکتا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''چاچا اشرف! کہیں کوئی چکر نہ ہو۔''

''کک... کیا مطلب؟'' اشرف پھر چونکا:

''کک... کہیں پولیس نہ ہو۔'' اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

''ہو سکتا ہے۔'' میں بولا۔

''اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی آپ کا دشمن ہو۔''

میری بات سن کر اشرف چارپائی پر بیٹھتا چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ یہ کہانی آگے بڑھے، آپ کو

''پپ... پٹھان!'' چچا غمزدہ آواز میں بولا۔

''پھر کیا ہوا۔'' میں نے کہا: ''آپ بیٹھک کا دروازہ کھول کر ان کی آمد کا مقصد معلوم کریں۔''

ایک مرتب پھر زوردار دستک ہوئی۔ اس مرتبہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دروازہ توڑ ڈالیں گے۔ چچا ڈرتا ڈرتا دروازے کے قریب پہنچا اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا:

''ہمیں اشرف سے ملنا ہے۔'' باہر سے آواز آئی۔

''ایک منٹ!'' اشرف بولا اور دروازہ بند کر کے واپس پلٹا۔ بیٹھک میں داخل ہوا اور بیٹھک کا دروازہ کھول کر بولا:

''آیئے... آیئے... خان صاحب تشریف لائیں۔'' میں بھی بیٹھک میں پہنچ گیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ تین ''ہٹے کٹے'' پٹھان بیٹھک میں داخل ہوئے اور چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔

''جی معزز مہمانو! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' اشرف پٹھانوں کے سامنے بچھا جا رہا تھا۔ پٹھان اس کے ''خلوص'' سے متاثر نظر آتے تھے۔ ایک پٹھان کے ہاتھ میں موٹا سا رجسٹر تھا۔

''ہمیں اشرف سے ملنا ہے۔'' ایک پٹھان بولا۔ اس کی بات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اشرف کی شکل سے ناواقف ہیں۔

''کک! کیا؟'' اشرف نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''ہمیں اشرف سے ملنا ہے۔'' رجسٹر والا پٹھان پھر بولا۔

''ہائے میرا بھائی اشرف!'' اشرف دکھ بھری آواز میں بولا تو میں نے چونک کر اسے دیکھا اور حیرت کے مارے اچھل پڑا۔ اشرف کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے تھے اور وہ غم کی تصویر نظر آ رہا تھا۔

''کیا ہوا بھائی؟'' ایک پٹھان بے اختیار بول اٹھا: ''آپ رونے کیوں لگے؟''

''کیا کروں خان صاحب! روؤں نہ تو اور کیا کروں۔ آپ نے تو میرے زخم ہرے کر دیے۔''

''کیا مطلب؟'' پٹھان چونکے۔

''میرا بھائی اشرف مر چکا ہے... ہائے ہائے!''

اشرف نے خود کش دھماکا کیا تھا۔

پٹھانوں کے ساتھ ساتھ میں بھی بری طرح چونک گیا۔ پٹھانوں کی شکلوں پر بارہ بجنے لگے تھے۔ اشرف کی اداکاری کمال کی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے تھے اور وہ بری طرح اپنے ''بھائی'' کی ''موت'' میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔

''بب... بہت افسوس ہوا۔'' ایک پٹھان بولا۔

''ہر ذی نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔'' دوسرا پٹھان بولا۔

''اللہ اسے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔'' تیسرے پٹھان نے کہا اور رجسٹر کھول لیا: ''آپ کے بھائی اشرف نے پندرہ سو کا کپڑا ہم سے ادھار لیا تھا۔ اس مہینے کا وعدہ تھا۔ اب آپ بتائیں ہم کیا کریں؟''

''تم بھی پاگل ہو۔'' پہلے پٹھان نے رجسٹر والے پٹھان کو سرزنش کی: ''دیکھ نہیں رہے کہ اس کا بھائی فوت ہو گیا ہے۔ پہلے فاتحہ پڑھ لیں۔'' پٹھان نے باقاعدہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو دوسرے پٹھانوں کے ساتھ میرے ہاتھ بھی اٹھ گئے۔

''نہیں چاہیے مجھے آپ کی فاتحہ اور اظہارِ افسوس!'' اشرف بری طرح بھڑک رہا تھا۔ اس کی آواز مارے ''جذبات'' کے بلند ہو گئی تھی: ''اشرف مرا نہیں زندہ ہے۔ زندہ ہے زندہ ہے۔ اشرف میرا بھائی زندہ ہے!''

پٹھانوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا اور دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھ نیچے گرا لیے۔ ایک پٹھان نے دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی کو اپنی کنپٹی پر رکھ کر گھمایا۔ گویا کہہ رہا ہو کہ اشرف کا ''بھائی'' تو پاگل ہے۔

''اب ہم کیا کریں۔'' رجسٹر والا پٹھان بولا: ''اشرف کا قرض کون ادا کرے گا؟''

''اس کا قرض میں ادا کروں گا۔'' اشرف جوش کے ساتھ بولا: ''میرا بھائی بہت اچھا آدمی تھا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کے نام قرض ہو اور بروزِ قیامت آپ اس کے گریبان میں ہاتھ ڈالیں۔ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میں اس کا سارا قرضہ ادا نہیں کر سکتا مگر کچھ روپے آپ کو دیتا ہوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ اشرف کا نام رجسٹر سے کاٹ ڈالیں اور اقرار کریں کہ آپ نے اشرف کا قرضہ معاف کیا۔''

اشرف بڑی روانی کے ساتھ بولتا چلا گیا تھا۔

''آپ ہمیں کتنے پیسے جمع کروا رہے ہیں؟'' ایک پٹھان نے سوال کیا۔

اب اشرف نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالا۔ جیبوں میں کچھ ہوتا تو برآمد ہوتا۔ اس نے روئے سخن

مسکراہٹ کے پھول

☆ استاد: فزکس کی تعریف سناؤ۔
شاگرد: سر! پوری نہیں آتی، آخر سے تھوڑی سی آتی ہے۔

استاد: اچھا چلو، وہی سنا دو۔
شاگرد: اور اسے فزکس کہتے ہیں۔

☆ استاد: جملہ مکمل کرو، نو سو چوہے کھا کے بلی... چلی
شاگرد: نو سو چوہے کھا کے بلی آہستہ آہستہ چلی
استاد: یہ کیا بدتمیزی ہے۔ ٹھیک سے جواب دو
شاگرد: سر! آپ استاد ہیں، اس لیے آپ کا لحاظ کرتے ہوئے یہ کہہ دیا ہے، ورنہ نو سو چوہے کھا کے بلی ہل بھی نہیں سکتی۔

☆ موٹر سائیکل پر تین آدمی بیٹھے ہوئے گزرے۔ سارجنٹ نے رکنے کا اشارہ کیا تو ان میں سے ایک نے کہا:
"پاگل ہو گئے ہو! کہاں بیٹھو گے۔"

☆ استاد: برفانی علاقوں میں کوئی کام نہیں ہو سکتا
شاگرد: کیوں جناب! برف کے گولے تو بیچ ہی سکتے ہیں۔ (محمد سہیل۔ رحیم یار خان)

☆ استاد: فلک بوس کا جملہ بناؤ۔
شاگرد: رات کو فلک بوس میں ستارے چمکتے ہیں
استاد: (جھلا کر) یہ تم نے جملہ بنایا ہے۔ اچھا برق رفتار کا جملہ بناؤ۔
شاگرد: پاکستان میں آبادی برق رفتار ہے۔
(میمونہ بنتِ محمد سعید انصاری۔ سرگودھا)

☆ ایک دوست: کل تمہارے ابو تمہیں کیوں مار رہے تھے۔
دوسرا دوست: یار میں نے قبرستان کے گیٹ پر لکھ دیا تھا، خوش آمدید۔ (حذیفہ۔ چکڑالہ)

☆ استاد: کوئی کہانی سناؤ۔
شاگرد: ایک دن میں چچا جان کے گھر گیا۔ وہ سوئے ہوئے تھے۔ دوسرے دن چچا جان میرے گھر آئے، تو میں سویا ہوا تھا۔
نتیجہ: جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔
(خواجہ نعمان طیب۔ نور پور نورنگا)

☆ میرے پھوپھا کو دل کی تکلیف بڑھنے پر ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ میں اپنی تین سالہ بچی کے ساتھ ان کی بیمار پرسی کے لیے گئی۔ انھیں آکسیجن اور ڈرپیں لگی ہوئی تھیں۔ پائپ چہرے اور ہاتھوں پر نظر آ رہے تھے۔ بچی نے مجھ سے پوچھا:
"امی! پھوپھا کو کیوں باندھا ہوا ہے۔"
میں نے مشکل سے ہنسی روکی تو اس نے دوسرا سوال کر دیا۔
"امی! پھوپھا آج کس کے گھر میں آئے ہوئے ہیں۔" (رفعت جبیں۔ جھنگ صدر)

☆ ڈاکٹر: آپ کون سا آئل استعمال کرتے ہیں؟
شیخ: صوفی کا آئل۔
ڈاکٹر: صابن کون سا استعمال کرتے ہیں؟
شیخ: صوفی کا صابن۔
ڈاکٹر: ٹوتھ پیسٹ؟
شیخ: صوفی کا۔
ڈاکٹر: صوفی بہت اچھی کمپنی ہے کیا؟
شیخ: نہیں! صوفی اور میں ایک ہی کمرے میں رہتے ہیں۔
(بنتِ سیف الرحمٰن قاسم۔ گوجرانوالہ)

☆ استاد: چاند کیوں روشن ہوتا ہے۔
شاگرد: اس لیے کہ واپڈا والے ابھی چاند تک نہیں پہنچے۔

☆ شیر کے پنجرے میں ایک بکری کو دیکھ کر چڑیا گھر کی سیر کرنے والا سیاح حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے گائیڈ سے کہا:
"واہ واہ! یہ بے نظیر منظر تو زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے، لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔"
گائیڈ نے جواب دیا: "یہ اس طرح ممکن ہے جناب کہ ہم روز ایک نئی بکری پنجرے میں چھوڑتے ہیں۔
(اسامہ طارق۔ میاں چنوں)

☆ استاد: (طالب علم سے) بیٹا کیوں پریشان ہو، پیپر نہیں آ رہا ہے کیا۔
شاگرد: یہ بات نہیں ہے سر، میں پریشان ہوں کہ اس سوال کا جواب میں نے کون سی جیب میں رکھا ہے۔

☆ کمرۂ امتحان میں ایک لڑکا اپنے سامنے والے لڑکے کے پرچے کو بہت غور سے پڑھ رہا تھا۔ استاد نے قریب آ کر پوچھا:
"یہ کیا کر رہے ہو؟"
شاگرد نے جواب دیا:
"سر! یہ دیکھ رہا ہوں کہ کہیں اس نے میرے پیپر کی نقل تو نہیں کی۔
(بنتِ عبدالقیوم۔ کراچی)

☆ دادا: بیٹا تمہاری ٹیچر آ رہی ہیں، چھپ جاؤ، کیونکہ تم آج سکول نہیں گئے۔
پوتا: چھپنے کی ضرورت مجھے نہیں دادا جان! آپ کو ہے۔ میں نے ٹیچر کو بتایا تھا کہ آپ فوت ہو گئے ہیں۔ (آمنہ لیاقت۔ کمالیہ)

☆ مریض: (ڈاکٹر سے) میں بہت خوش رہتا ہوں۔ کوئی پریشانی نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے ڈاکٹر صاحب!
ڈاکٹر: میری سمجھ میں آپ کی بیماری آ گئی ہے۔ آپ کو شادی کی ضرورت ہے۔

میری طرف موڑا:
"شہزاد بیٹے! دو سو روپے دو، پلیز!" اس کی آواز میں التجا تھی۔
میں نے بے اختیار اپنی جیب سے دو سو روپے نکال کر اشرف کے حوالے کیے جنھیں اس نے فوراً پٹھانوں کی طرف بڑھا دیے۔
"خان صاحب! نیکی کر دریا میں ڈال۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے گا۔" اشرف نے خالص "مولویوں" کے انداز میں کہا تھا۔
رجسٹر والے پٹھان کو اچانک جوش آ گیا۔ اس نے اشرف کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کیا اور رجسٹر کھول کر اشرف کا نام کاٹا اور جوش کے ساتھ بولا:
"آپ سب گواہ ہو جائیں۔ میں نے اشرف کا قرضہ اللہ اور اللہ کی رضا کی خاطر معاف کر دیا۔"
یہ کہہ کر وہ اٹھا اور بیٹھک کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ باقی دو پٹھان بھی اس کے پیچھے تھے۔
پٹھانوں کے جانے کے بعد اشرف نے بیٹھک کا دروازہ بند کیا اور بولا:
"شہزاد بیٹے! پہلے آپ کے کتنے روپے دینے ہیں؟"
"آٹھ سو روپے۔" میں بے اختیار بول اٹھا۔
"آٹھ سو روپے اور دو سو ملا کر ہزار ہو گئے نا؟"
"ہاں! کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی بہت کچھ سمجھ کر میری مری مری آواز نکلی۔
"شہزاد بیٹے! تم تو اپنے ہو اور بہت اچھے ہو۔"
اشرف فلسفیانہ لہجے میں بولا: "بہت جلد تمہارا قرضہ بھی اتار دوں گا۔ ابھی تو تمہارے سامنے پندرہ سو روپے کا قرض چکایا ہے۔"
اور میں حیرت کے مارے بت بنا اسے جیب میں دو سو روپے ڈالتے دیکھتا رہ گیا!

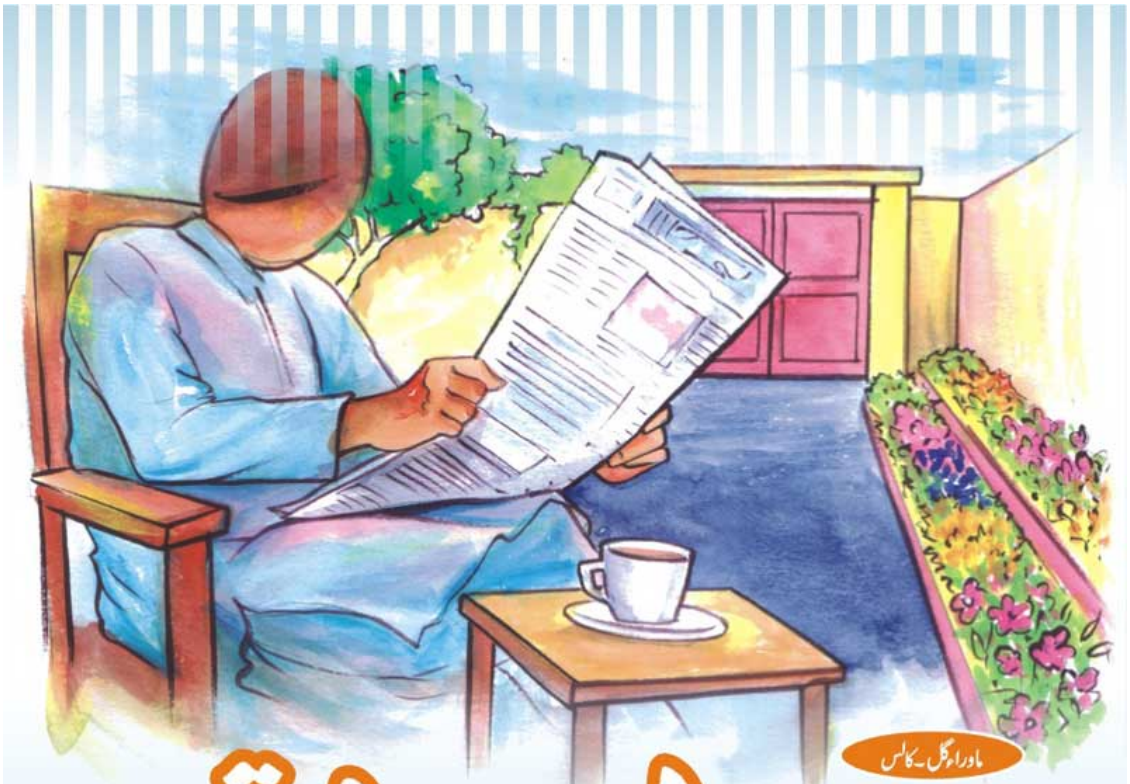

ادب کے قرینہ

ماوراء گل ۔ کالس

انس نے اپنے کپڑوں پر سے سلوٹوں کو جھاڑا اور فائل مضبوطی سے پکڑے کمرے سے باہر چلا آیا۔

اماں جان آنگن میں چار پائی بچھائے اس کے لیے سویٹر بُن رہی تھیں۔ انھوں نے موٹے عدسے کا چشمہ لگا رکھا تھا۔

کشادہ آنگن کے دائیں جانب پھولوں کی دو کیاریاں تھیں ... ان میں ترتیب سے لگے نیلے، پیلے، گلابی اور سرخ رنگ کے پھول لہلہا رہے تھے ... ابا جان ہر روز ان کو پانی دیا کرتے ... وہ کبھی ان کی کانٹ چھانٹ کرتے نظر آتے اور کبھی گوڈی کر رہے ہوتے ... وہ اس وقت اخبار پڑھنے میں مشغول تھے ... پاس پڑی چھوٹی میز پر چائے کا کپ رکھا تھا ...

''اچھا میں چلتا ہوں۔'' انس نے لاپروائی کے انداز میں زور سے کہا ... اماں جان اور ابا جان نے بیک وقت نظریں اُٹھائیں ... دونوں نے اسے دیکھا، پھر اپنے اپنے کام میں مشغول ہو گئے ...

رات ابا جان نے گھنٹا بھر بیٹھ کر اُسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھائی تھی ... یہ بھی کہ کامیابی کی پہلی سیڑھی اللہ پر توکل ہے ... اس کے بعد عاجزی اور فرماں برداری کامیابی کی راہیں کھول دیتی ہے ... مگر اسے یہ کون سمجھائے ... اُس نے سب باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیں ... وہ ہمیشہ یوں ہی کیا کرتا تھا ... ابا جان کی ساری باتیں سن لیتا مگر کرتا اپنی من مانی ہی تھا ... ابا جان اُسے ''بے ادب، بدتمیز'' کا لقب دے کر خاموش ہو جاتے ... وہ خاموشی سے صحن عبور کر گیا ...

''فی امان اللہ ...'' اماں جان نے آہستگی سے کہا ... ابا جان بھی زیرِ لب کچھ بڑبڑائے ... شاید وہ بھی ''تمھیں اللہ کے حوالے کیا'' کہہ رہے تھے ...

☆

انس جب گھر سے نکلا تو اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے ... آج بھی ایک جگہ اس کا انٹرویو تھا ... پچھلے تین سالوں سے نوکری کے لیے وہ مارا مارا پھر رہا تھا ... بلکہ شوقیہ پھر رہا تھا ... مگر کہیں بات نہ بنی ... اس کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ ''غیر سنجیدہ رویہ'' تھا ... جب مینیجر اس سے انٹرویو لے رہا ہوتا تو وہ خود کو کوئی مہمانِ خصوصی تصور کرتا تھا ... یہی ابا جان اُسے سمجھاتے کہ عاجزی اختیار کرنے سے انسان ترقی کی منزلیں طے کرتا ہے ... مگر وہ نہیں سمجھ سکتا تھا ...

آج خلافِ معمول وہ بہت سنجیدگی سے انٹرویو دے رہا تھا ... آج اُسے نوکری ملنے کی پوری توقع تھی ... کیونکہ اس کمپنی کے مالک کے بیٹے سے اس کی پرانی دوستی تھی ... اور آج اُسی کے ذریعے سے وہ کمپنی کے انٹرویو پینل میں بیٹھا تھا۔ کافی سوالات کرنے کے بعد مینیجر صاحب نے کہا:

''مسٹر! آپ کے پاس تجربہ تو بالکل ہے ہی نہیں ... ہم آپ سے معذرت کرتے ہیں کہ ہمارے پاس بہت سے تجربہ کار اُمیدوار ہیں ... جن میں سے ایک کو منتخب کر لیں گے۔'' مینیجر کے الفاظ ہتھوڑا بن کر اُس پر برسے۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہ سیدھا گھر جانا چاہتا تھا ... مگر وہ پارک میں چلا آیا ... پارک میں قدرے سکوت تھا ... وہ ایک سنگی بنچ پر تھکے تھکے سے انداز میں بیٹھ گیا ... تب ہی اس کے پاس ایک شوخ سی آواز گونجی ...

''السلام علیکم انس ... بھئی کہاں ہوتے ہو آج کل؟'' یہ اُس کا دوست عثمان تھا ... دونوں نے اکٹھے تعلیم حاصل کی تھی ... زمانہ طالب علمی میں عثمان اُس سے ہمیشہ آگے ہی رہا کرتا تھا ... انس کھڑا ہو گیا ... اب وہ عثمان سے مصافحہ کر رہا تھا ... عثمان کے ساتھ اس کے والد بھی تھے ...

''کیا حال ہے انکل؟'' وہ اُن سے ملا۔

''اللہ کا شکر ہے ... تم سناؤ خیریت ہے ناں ... تمہارے ابا کا کیا حال ہے؟''

''جی الحمدللہ، سب خیریت ہے ... ابا گھر ہی ہوتے ہیں۔''

وہ سر ہلانے لگے ... اب وہ تینوں ہلکے ہلکے چہل قدمی کر رہے تھے ... فضا کا بوجھل پن آہستہ آہستہ ختم

ہو رہا تھا... عثمان اپنی مصروفیات بتا رہا تھا... وہ پولیس کے محکمے میں اے ایس پی تھا... انس نے رشک سے اُسے دیکھا، وہ ہمیشہ یوں ہی کامیابیاں سمیٹتا آ رہا تھا...

''شاید کچھ لوگوں کی قسمت میں کامیابیاں ہی کامیابیاں لکھ دی جاتی ہیں۔'' وہ سوچ رہا تھا۔

''میں تو کہتا ہوں... یہ سب میرے والدین کی دعاؤں سے ہے... اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اُس نے مجھے والدین جیسی نعمت سے نوازا ہے۔'' عثمان کے لہجے میں انکساری تھی۔

''برخوردار! میں تو کہتا ہوں... اس میں آپ کی فرمانبرداری کا زیادہ ہاتھ ہے... فرض کیا تم ہمارا کہنا نہ مانتے اور اپنی ہی کرتے تو... میں یقین سے کہتا ہوں کہ تم اب تک خوار ہو رہے ہوتے... تو میں کہتا ہوں... آپ کی فرمانبرداری کامیابیوں کے زینے طے کرنے میں مدد دیتی ہے۔'' عثمان کے والد اسے بتا رہے تھے... اور وہ سر ہلا رہا تھا... مگر انس کا سر چاہنے کے باوجود نہیں ہل رہا تھا... وہ جیسے ساکت سا ہو گیا تھا...

☆

رات جب اندھیرا چھا گیا... اور تارے ٹمٹمانے لگے تو وہ اماں جان کے سامنے بیٹھا... ان کے ہاتھ کا بُنا سویٹر بہت شوق سے دیکھ رہا تھا...

''بہت پیارا بُنا ہے اماں جان... آپ نے تو کمال کر دیا۔'' اور اماں جان دل ہی دل میں اسے ڈھیروں دعائیں دینے لگیں... اُس نے عشاء کی نماز کے لیے اماں جان کو پانی گرم کر کے دیا... وہ اب بہت کمزور ہو گئی تھیں... اور بوڑھی بھی... انس نے ان کے لیے اور ابا جان کے لیے چائے بنائی...

اور اب وہ ابا جان کے سامنے بیٹھا اُن کی نصیحتیں سن رہا تھا:

''ابا جان... میں نے نوکری کے لیے ہر ممکن کوشش کی مگر مجھے نوکری نہیں مل سکی... میں نے بہت غور کیا... اور اس نتیجے پر پہنچا کہ میں آپ کا نافرمان بیٹا ہوں... جس کی وجہ سے مجھے رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔'' وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔

''ہوں!'' انھوں نے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔

''میں ایک مشورہ دیتا ہوں تمھیں... اس پر عمل کرو... اگر تمھیں اچھی پوسٹ کی نوکری نہیں مل رہی تو ابتدا کسی معمولی کام سے کر لو... پھر آہستہ آہستہ ان شاء اللہ تم ترقی کرتے جاؤ گے... ہر کام کے لیے ایک آغاز ہوتا ہے... اور آغاز تھوڑے سے ہی ہوتا ہے... ایک دم اوپر والی سیڑھی پر قدم نہیں رکھ سکتے بیٹا... میری مانو! میرا تجربہ یہی کہتا ہے۔''

انس کو اس لمحے یہ نصیحت سننا بہت مشکل لگ رہا تھا... بھلا وہ نک سک سے تیار رہنے والا... اور اپنی ایک خاص پہچان رکھنے والا معمولی کام کیوں کرتا؟ مگر آج اُس نے ایک خاص سبق سیکھا تھا... اور وہ فرمانبرداری سے سر ہلانے لگا... ابا جان بے اختیار مسکرا دیے...

''مگر ایک بات یاد رکھنا... ہمیشہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا... ہر کام اُس ذات کے نام سے شروع کرنا... اللہ تمہارے لیے آسانیاں فرمائے۔''

''آمین۔'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

☆

پھر اُس نے ایک مل میں معمولی ورکر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا... کئی بار اس کے قدم ڈگمگائے... مگر اُس نے اللہ پر بھروسہ کر کے یہ کام شروع کیا تھا... اس لیے مطمئن تھا... اُسے معمولی ورکر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے چھ ماہ ہو گئے تو ابا جان نے اُسے پھر بلا لیا...

''بات سنو! اب تم اس کمپنی میں اچھی پوسٹ کے لیے انٹرویو دے دو... انشاء اللہ کامیاب ہو جاؤ گے۔''

وہ حیران تو ہوا مگر کہا کچھ نہیں...

کمپنی والے اس کی کارکردگی کو اچھی طرح جانتے تھے... انھوں نے بغیر کسی پس و پیش کے اُسے ترقی دے دی... پھر وہ سیڑھی سیڑھی کر کے ترقی کرتا گیا... اور ایک وہ بھی دن آیا جب مینیجر کی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا...

تب ابا جان نے اُسے ایک اور نصیحت کی:

''بیٹا! تم نے سیدھا راستہ اختیار کر کے اللہ تعالیٰ سے مانگا اور تمھیں تمہاری توقع سے زیادہ مل گیا... اب تمھیں چاہیے کہ دنیا کی حرص چھوڑ کر آخرت کی فکر کرو... اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔'' وہ اثبات میں سر ہلانے لگا اور ابا جان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''ابا جان! میں ہر لمحے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں... جس نے والدین جیسی نعمت مجھے عطا کی... مجھے یقین ہے آپ کی دعاؤں نے میری زندگی بدل ڈالی۔''

''برخوردار! آپ کی کامیابی میں آپ کی فرمانبرداری کا بہت ہاتھ ہے... اور آپ کی عاجزی کا... اللہ تعالیٰ کو عاجزی اختیار کرنے والے بندے پسند ہیں... اللہ تعالیٰ عاجزی اختیار کرنے والوں پر آسانیوں کا در کھول دیتے ہیں۔''

وہ چونک گیا، اس کے والد بھی وہی باتیں کہہ رہے تھے جو اس روز عثمان کے والد پارک میں کہہ چکے تھے۔

اردو زبان کے ایک لفظ ''بربریت'' کی حقیقت

ہمارے یہاں اردو زبان میں ایک لفظ ''بربریت'' کا بہت استعمال ہے۔ مثلاً کہیں ہم پڑھتے ہیں کہ ''کشمیریوں پر ظلم و بربریت کی انتہا ہو گئی'' کہیں اس کا کچھ استعمال ہوتا ہے، کہیں کچھ مگر اس لفظ کی حقیقت اور معنوں سے ہم واقف نہیں ہیں، ورنہ اس کا استعمال نہ کرتے۔ آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ ''بربریت'' ہے کیا؟

افریقہ کے جنگجو قبیلے نے اسلام کی سچائی سے متاثر ہو کر دین اسلام قبول کر لیا جس کے بعد تیزی سے دوسرے قبائل والوں نے بھی دین اسلام کو سمجھا اور اپنایا۔ وہاں کے یہ جنگجو قبائل ''بربر'' کہلاتے تھے۔ ان قبائل نے اسلام کی سربلندی اور ظلم کے خاتمے کے لیے بڑی جواں مردی دکھائی۔ مغرب کو یعنی اسلام دشمن طاقتوں کو افریقہ میں اسلام کے غلبے سے بڑی تکلیف پہنچی۔ اس نے ایک سازش کے تحت بربر قبائل کو بدنام کرنے کے لیے لفظ بربریت ''بربریت'' کا نام دے کر گالی بنا دیا اور وحشی لوگوں کے لیے مغرب نے بربرین (Barbarians) کا استعمال شروع کر دیا۔ اصل مقصد مسلمانوں کی جرأت، عظمت اور سربلندی کو مٹانے کی سازش تھی۔

ہم نے اسے کامیاب بنانے کے لیے اس لفظ کو ظلم و ناانصافی جیسے معنوں میں لینا شروع کر دیا۔ کیا اب بھی آپ اس لفظ کا استعمال کریں گے؟ نہیں ناں؟ پھر اس کی جگہ ہم کیا استعمال کریں تو سنیے! آپ اس کی جگہ ''سربریت'' استعمال کریں، کیوں کہ یورپی ملک سربیا کے سرب عیسائیوں نے بوسنیا کے مسلمانوں پر وہ ظلم توڑے ہیں کہ درندے بھی شرما جائیں۔ اس لیے ظلم و ستم کی صحیح علامت لفظ ''سربریت'' ہے۔ (عبرت انگیز واقعات)

عبدالرحمٰن واشکی۔ کراچی

ہاسٹل

حافظ محمد حسن سرفراز۔ یو ای ٹی ٹیکسلا

یہ پہلا موقع تھا کہ ہم کسی ہاسٹل میں گھوم رہے تھے۔ گھوم رہے تھے اور حیران ہو رہے تھے۔ ہنس رہے تھے اور ہنس ہنس کے ہلکان ہو رہے تھے۔ ایک بالکل الگ قسم کی زندگی ہمارے سامنے تھی جو ہماری حیرت کا سبب تھی اور کمروں کے دروازوں پر ہاسٹل کے رہنے والوں کے جملے ہمیں ہنسنے پر مجبور کر رہے تھے۔ اگرچہ ہنسنا، ہم ایسوں کے نصیب میں کہاں! زمانے نے کچھ ایسے ستم ڈھائے ہیں کہ اب ہم ہنستے نہیں، قہقہے لگاتے ہیں، بلند بانگ اور برہنہ قہقہے، ایک دروازے پر یہ اطلاع درج تھی:

''آگے کام ہو رہا ہے، تکلیف کے لیے معذرت خواہ ہیں۔'' ایک پہلوان نے خبردار کیا تھا۔ ''یاد رکھیے! اندر داخل ہونے کے بعد اپنی حفاظت کے آپ خود ذمے دار ہیں۔'' ایک تحریر یہ تھی:

''براہِ کرم اوکھلی میں سر نہ دیں۔'' ایک دروازے کی تحریر خوش خبری سنا رہی تھی۔ ''خوش خبری! اُبلے انڈے دستیاب ہیں۔''

اُس وقت ہاسٹل میں گھومتے ہوئے ہمارے جی میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کاش ہم بھی یہاں قدم رنجہ فرمائیں۔ خدا تعالیٰ ہماری مغفرت فرمائیں، آج عرصہ دو سال سے ہم ہاسٹل کی اس البیلی چنچل زندگی کا حصہ ہیں اور ہم نے اپنے کمرے کے دروازے پر میر کا یہ شعر درج فرمایا ہے:

''سرہانے میر کے آہستہ بولو!
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے۔''

دوستو! ہاسٹل کی زندگی واقعتاً بڑی لاپروا ہے۔ بے فکری اور لاابالی۔ لڑکے یہاں گھروں سے روتے ہوئے آتے ہیں اور پھر اس زندگی میں ایسے مدغم ہوتے ہیں کہ گویا بھول جاتے ہیں۔ کون ہیں؟ کہاں سے آئے تھے؟ خود ہم شروع میں رات کو سو نہ سکتے تھے، کیونکہ گھر کی یاد ستاتی تھی اور اب حال یہ ہے کہ گھر اور گھر والے اُس وقت یاد آتے ہیں جب پیسے ختم ہونے لگتے ہیں۔ خدا! اتنا بے وفا کسی کو نہ کرے۔

یہاں اپنی مرضی کے آپ خود مالک ہیں اور اپنے کیے کے خود ذمے دار ہیں۔ کوئی آپ کی اجازت کے بغیر آپ کے معمولات میں دخل نہیں دے سکتا، نہ آپ کے معاملات میں ٹانگ اڑا سکتا ہے، نہ آپ کو کسی کام سے روک سکتا ہے، نہ آپ کو کچھ نصیحت کر سکتا ہے، چنانچہ آپ کی طبیعت اگر فاقہ کرنے کو چاہ رہی ہے تو ایک وقت کا کھانا چھوڑ دیجیے، دو وقت کچھ نہ کھائیے، بلا سے پورا مہینا کچھ نوش نہ فرمائیے، کسی مائی کے لال میں جرأت ہے کہ آپ کو احساس دلائے اور کچھ کھانے کو کہے۔ بالکل اسی طرح اگر آپ آرام کرنا چاہتے ہیں تو بستر میں گھس کر سو رہیے۔ پھر جب تک جی چاہے، سوتے رہیے۔ کسی کی کیا مجال جو آپ کو جگانے کا گناہ اپنے سر لے، چنانچہ انھی آزادیوں کا فائدہ اٹھا کر ہم نے مولی کو چائے میں ڈبو کر کھانے کے مزے اٹھائے ہیں، گرمیوں کی راتوں میں لسی کے جام پیے ہیں، سخت جاڑے میں صرف قمیص شلوار میں گھومے ہیں۔ جون جولائی میں رضائی لے کر سوئے ہیں اور یقین مانیے! کبھی کسی نے ہمیں روکا نہیں۔ ٹوکا نہیں، دراصل یہی وہ آزادیاں ہیں جو لڑکوں کو ہاسٹل کی طرف کھینچتی ہیں۔ ہاسٹل میں آپ کا کمرہ آپ کی جائے پناہ ہے، اسے آپ اپنا قصرِ حکومت، محل سرا اور جاگیر وغیرہ بھی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ یہ وہ جگہ ہے جہاں آپ خودکشی کے علاوہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ مثلاً گا سکتے ہیں، قوالی کر سکتے ہیں، گانے کی مشق فرما سکتے ہیں، حتیٰ کہ دھمال بھی ڈالنا چاہیں تو شوق سے ڈالیے۔ ہم کہ خدا تعالیٰ نے گانے کا ذوق عطا کیا ہے، فارغ اوقات میں جی بھر کر اپنی آواز کا جادو جگاتے ہیں، ورنہ گھر میں ہمیں اس کی اجازت نہیں تھی، کیونکہ مشق نہ ہونے کی وجہ سے لے بیچ میں کچھ ڈگمگا سی جاتی تھی اور سامعین خصوصاً ہماری والدہ کو سُر کچھ بھلا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اب ایسا نہیں ہے، بلکہ اب تو مسلسل مشق کی برکت سے ہم جو کبھی موج میں آ کر دھما چوکڑی بھی مچائیں تو ایسا ربط پیدا کرتے ہیں کہ وہ صوفیوں کا رقص معلوم ہوتی ہے۔ ہاسٹل میں رہتے ہوئے بعض ضروریات کی اشیاء آپ کے کمرے میں موجود ہونا ازحد ضروری ہے۔ جیسے کنگھی، شیشہ، استری، صفائی کا برش، شو پالش وغیرہ، لیکن بدقسمتی سے ہمارے کمرے میں ان میں سے ایک بھی چیز موجود نہیں۔ چنانچہ اپنی زلفوں کو سنوارنے کے لیے ہم اپنے دائیں جانب والے پڑوسی کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور کپڑے استری کرنے کے لیے بائیں جانب والے پڑوسی سے رجوع کرتے ہیں۔ ہمارے پڑوسی بہت اچھے اور سخی طبیعت کے لوگ ہیں، کبھی نہ نہیں کرتے۔ جانتے ہیں نہ کریں گے تو پھر صبح صبح صابن اور شیمپو کس سے مانگیں گے؟

چھٹی والے دن کے علاوہ صبح کا سورج ہاسٹل میں ہر روز ایک افراتفری اور ہڑبونگ کا بگل بجا کر طلوع ہوتا ہے۔ صبح کے سہانے وقت سے لطف اندوز ہونے والے صرف وہ سحر خیز ہوتے ہیں جو ہاسٹل کی اصطلاح میں سرِ شام ہو جاتے ہیں۔ انھی خوش قسمتوں کو غسل خانوں میں پانی گرم ملتا ہے اور یہی وہ نادر مخلوق ہے جو وقت کی پابندی کہلاتی ہے، ورنہ جو راتوں کو جاگنے میں اُلّوؤں سے مقابلے لگائیں گے، وہ کیونکر جلدی اُٹھیں؟ ایسے لوگ کبھی سورج کو طلوع ہوتا دیکھ لیں تو اپنی قسمت پر رشک کرنے لگتے ہیں، چنانچہ ہم ایسے لڑکے کلاسز شروع ہونے سے آدھ گھنٹا قبل بمشکل اپنے بستروں سے نکلتے ہیں اور صابن تولیہ ڈھونڈ کر غسل خانوں کی طرف دوڑتے ہیں جہاں صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ چند لڑکے جو ہم سے کچھ لمحے پہلے تشریف لے آئے تھے۔ اب واش رومز پر پہلے آؤ، پہلے پاؤ کی بنیاد پر قابض ہیں اور باہر لائن میں کھڑے لڑکوں کی ہزار التجاؤں، درخواستوں، گزارشوں اور دھمکیوں کے باوجود یہ قبضہ چھوڑنے کو تیار نہیں۔ جب یہ معمہ کسی طور حل نہیں ہوتا تو ایک لڑکا بے صبری اور بے چینی کے عالم میں زور زور سے برش دانتوں پر رگڑتے ہوئے ایک واش روم کے دروازے پر زوردار لات برساتا ہے، پھر چلاتا ہے۔ ''سو گیا ہے! کمینہ؟ نکل بھی آ'' اس پر اندر سے گھٹی گھٹی آواز میں جواب برآمد ہوتا ہے۔ ''آیا بھائی! بس دو منٹ!'' یہ اس بات کی نوید ہے کہ اگلے آدھے گھنٹے میں کسی وقت آپ کی باری بھی آ جائے گی۔ اس وقت کوئی کتنی بھی جلدی کیوں نہ دکھا لے، کلاس میں کبھی وقت پر نہیں پہنچ سکتا۔ نتیجہ یہ کہ کلاس میں داخل ہوتے ہی پروفیسر دیر سے آنے پر واپس باہر کی راہ دکھا دیتا ہے۔ عقل مند لڑکے اس تنبیہ سے سبق سیکھتے ہیں۔ یعنی اگلے دن وقت پر آنے کا تہیہ کر کے کمرے میں جا کر پھر سو جاتے ہیں۔ ہاسٹل میں کھانا کھانے کی جگہ کو لنگر خانہ کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے میس ہال کہتے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں روزانہ سینکڑوں مرغیاں اپنی جانوں سے جاتی ہیں، لیکن کھانے والوں کو مزہ نہیں آتا اور جہاں کھانوں کے ذائقوں اور مزوں کو یکسانیت کے ایک نقطے پر مرکوز کیا جاتا ہے۔ یعنی سبزیوں، دالوں اور گوشت کے نسلی امتیازات کو مٹایا جاتا ہے، چنانچہ ہاسٹل کے میس میں ہمیں مونگروں کی بھجیا میں چنے کی دال کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے اور چنے کی دال میں مرغ کے قورمے کا مزہ ملتا ہے۔ مرغ کے قورمے کو صرف پہچان میں آسانی کے لیے قورمہ کہتے ہیں، ورنہ اصل یہ مونگروں کی بھجیا ہے۔ مزے کی بات یہ کہ اوپر ذکر

نیوز چینل

محمد شاہد فاروق۔ ایم اے ایم ایڈ۔ پھلور

آج پھر پیش کیا جارہا ہے ایک نیا پروگرام اور وہ بھی سلام عرض کرنے کے بعد! امید ہے کہ آپ اس آفت کے لیے ذہنی طور پر پہلے سے تیار ہوں گے، لیکن اگر آپ ابھی تک ذہنی طور پر تیار نہیں ہیں تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے، کیونکہ مدیر صاحب نے ہمیں اجازت دے رکھی ہے کہ ہم جب چاہیں نیوز چینل کا ڈرون حملہ کردیں اور ہم اس اجازت سے امریکہ کی طرح بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں اور قارئین کے احتجاج کو عوامی احتجاج سمجھتے ہوئے اس پر کان نہیں دھرتے، کیوں کہ اگر ہم اس احتجاج پر کان دھریں گے تو ہوسکتا ہے کہ کان پر جوں رینگ جائے اور جب جی چاہتا ہے اپنا ڈرون داغ دیتے ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے اس ڈرون حملے کے بعد تنقیدی بمباری عروج پر ہوگی اور بہت سے میزائل بھی داغ دیے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی خبروں کا وقت ہوا چاہتا ہے جس کے لیے آپ نے ہماری اوٹ پٹانگ قسم کی تمہید پڑھی ہے۔

تازہ ترین اطلاعات کے مطابق مدیر صاحب کا اقرباء پروری کا سلسلہ مسلسل جاری ہے اور حذیفہ حیدر آف بیچ گرائیں ننگ آمد بجنگ آمد پر عمل کرتے ہوئے میدان میں کود پڑے ہیں اور مدیر صاحب کو دھمکی دی ہے کہ اگر انھیں ان کا حق نہ دیا گیا تو وہ انھیں بچوں کا اسلام کی عدالت میں لے جائیں گے۔ تفصیلات کے مطابق حذیفہ صاحب نے قارئین کے لیے مسکراہٹ کے پھول بھیجے جنھیں مدیر صاحب نے حسب روایت ایسے ہی اپنی لاڈلی ردی کی بالٹی کے سپرد کردیا جیسے حکومتی عہدیداروں نے زلزلہ زدگان کی امداد کے لیے آئے ہوئے کمبل اپنوں میں بانٹ دیے تھے۔ اس پر حذیفہ صاحب نے خون کے آنسو روتے ہوئے کہا ہے کہ وہ اس ناانصافی پر بھرپور احتجاج کریں گے اور بچوں کا اسلام کی عدالت سے رجوع کریں گے۔ دوسری طرف مدیر صاحب نے بھی ''تھاپی'' لگاتے ہوئے انھیں میدان میں اترنے کا چیلنج دے دیا ہے۔ ہمارے غیر حاضر دماغ نمایندے کی خودساختہ رپورٹ کے مطابق اس چیلنج کے بعد حذیفہ صاحب طویل صلاح مشورے کررہے ہیں کہ اگر اس مقابلے میں انھیں منہ کی کھانی پڑی تو وہ دوستوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے اور دوست کہیں گے کہ ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ منہ دھو رکھو، یہ مقابلہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ مگر تم منہ اٹھا کے عدالت کو چل پڑے، شکر کرو، عدالت نے یہ نہیں کہہ دیا کہ یہ منہ اور مسور کی دال، ورنہ تم وہیں اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے اور سوچتے کہ اب کس منہ سے دوستوں کا سامنا کروں گا۔ امید ہے کہ غیر حاضر دماغ نمایندے کی رپورٹ ہوائی فائرنگ ثابت ہوگی اور حذیفہ صاحب بے خطر میدان میں کود پڑے ہوں گے۔ اگر عدالت نے ان کا ساتھ دیا تو اس مقابلے میں مدیر صاحب کو دانتوں پسینہ آسکتا ہے۔ اگر حذیفہ صاحب کو کہیں سے لوہے کے چنے مل گئے تو وہ لوہے کے یہ چنے بھی مدیر صاحب کو چبوا سکتے ہیں۔ مقابلے کا انتظار کیجیے۔

تازہ ترین اطلاعات کے مطابق حافظ محمد اشرف آف حاصل پور بچوں کا اسلام کے وزیر داخلہ بن گئے ہیں اور انھوں نے اپنے عہدے کا چارج سنبھالتے ہی بچوں کا اسلام میں امن وامان کی صورتِ حال کو قابو میں رکھنے کے لیے غیر حاضر دماغ نمایندے پر پابندیاں عاید کرنا شروع کردی ہیں۔ تفصیلات کے مطابق حافظ صاحب نے بچوں کا اسلام کی انتظامیہ کو حکم دیا ہے کہ غیر حاضر دماغ نمایندے کو نیوز چینل تک محدود کردیا جائے۔ ہمارے ایک تبصرہ نگار کا کہنا ہے کہ غیر حاضر دماغ نمایندے پر ان پابندیوں کی وجہ ''پہلا قدم'' ہوسکتی ہے۔ جس میں بڑے غیر سنجیدہ انداز میں غیر حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا گیا۔ اس بات کی ایک اور رُخ سے تحقیقات جاری ہیں کہ حافظ صاحب کے آگ بگولا ہونے کی وجہ یہ تو نہیں کہ انھیں ان کی قابلیت دیکھ کر کسی نے ایم اے کی اعزازی ڈگری کی آفر کردی ہو، جو انھیں ناگوار گزری ہو۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو، نیوز چینل کو سب جیل کا درجہ دے کر غیر حاضر دماغ نمایندے کو نظر بند کرنے کی تیاریاں شروع ہوچکی ہیں۔

تازہ ترین اطلاعات کے مطابق سارہ الیاس آف ڈیرہ غازی خان سیاست دانوں سے بھی بازی لے گئی ہیں۔ وہ عوام کو سبز باغ دکھاتے ہیں۔ انھوں نے کرداروں کو سبز خواب دکھانا شروع کردیے ہیں۔ غیر حاضر دماغ نمایندے نے اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سنہرے خواب، سہانے سپنے اور ڈراؤنے خواب تو بہت سے لوگ دیکھتے ہیں مگر سبز خواب دکھانا سارہ الیاس صاحبہ کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ غیر حاضر دماغ نمایندے کا مزید کہنا تھا کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کردار ساون کا اندھا ہو، کیونکہ ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی نظر آتا ہے۔ اس لیے اسے خواب بھی ہرے بھرے یعنی سبز رنگ کے نظر آتے ہوں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس نے نئی نئی آنکھ بنوائی ہو اور آنکھ پر سبز پٹی کی وجہ سے سبز خواب نظر آتے ہوں۔

کھیل:۔ ہمارے کھیلوں کے نمایندے کی تازہ ترین رپورٹ کے مطابق مہنگائی کا سپر سکسز ٹورنامنٹ شروع ہوچکا ہے جس میں مختلف محکمے عوام کے چھکے چھڑانے میں مصروف ہیں۔ اس موقعے پر ہمارے نمایندے کے ہوش اڑ چکے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ چہرے پر ہوائیاں بھی اڑ رہی ہیں، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا ہے، اس لیے ٹورنامنٹ کا بقیہ حصہ دیکھنے کے لیے خود ہی بازار کا رخ کریں۔

موسم:۔ موسم کا حال سنانے سے پہلے ہی ہمارے نمایندے کے خبری فیوز اڑ گئے ہیں، اس لیے ہم بلا اجازت نیوز چینل ختم کرتے ہیں۔ اللہ حافظ!

کیے گئے کھانوں کا مجموعی ذائقہ ہم بریانی اور پلاؤ میں محسوس کرتے ہیں، جب کہ بریانی اور پلاؤ بہن بھائی ہیں۔ ایک ذائقہ دو نام ہیں۔ ہم جب اپنا گھر چھوڑ کر آئے تھے تو یہاں اور وہاں کی چیزوں میں کوئی غیر معمولی فرق ہمیں نظر نہیں آیا تھا، لہٰذا یہاں کا کھمیا ویسا ہی ٹیڑھا تھا۔ یہاں کی بلی ویسی ہی کھسیانی تھی۔ حد یہ کہ یہاں کی روٹی بھی ویسی ہی چوکور تھی۔ یہ دیکھ کر ہمیں اچھے لڑکے کی طرح واپس چلے جانا چاہیے تھا، لیکن ہم یہاں کے کھانوں میں تبدیلی دیکھنے کا خیال رکھے ہوئے تھے۔ جب یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا تو ایک دفعہ ہم میس کے باورچی کے روبرو پیش ہوئے جو اُس وقت اپنی توند جیسی عظیم دیگ میں اپنے قد سے دوگنا بڑا بیلچہ گھما رہے تھے۔ ہم نے اجازت پا کر دست بستہ اپنی شکایت پیش کی تو انھوں نے اچھی خاصی جھاڑ پلا دی۔ بولے! ندیدو! چٹخورو! ہم لوگ جتنی بھی کوشش کر لیں کہ تمھیں گھر سے دوری کا احساس نہ ہو، جتنے بھی مصالحے ڈال لیں، جتنا اچھا پکا لیں، تمھیں پھر بھی شکایت ہی رہتی ہے۔ جاؤ لگا دو جس سے بھی لگانی ہے میری شکایت۔ وارڈن صاحب بھی میرے ہاتھ کا پکا ہوا کھاتے ہیں۔'' ہم انھیں بتا نہ پائے کہ گھر سے دوری کا احساس ہمیں قطعاً کوئی احساس نہیں ہے، کیونکہ مرغی یہاں کی بھی دال برابر ہے، سبزی یہاں کی بھی ہمیں کبھی اچھی نہیں لگی اور یہاں کی دال چکھ کر ہمارا اب بھی بھوک ہڑتال کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ہمیں ہاسٹل کے نوٹس بورڈ پر لکھا، وہ جملہ ابھی تک یاد ہے جو تم نے پہلے دن یہاں نازل ہوکر پڑھا تھا۔

''ہمارا نصب العین! طلباء کو گھر سے دور، گھر جیسا ماحول میسر ہو۔''

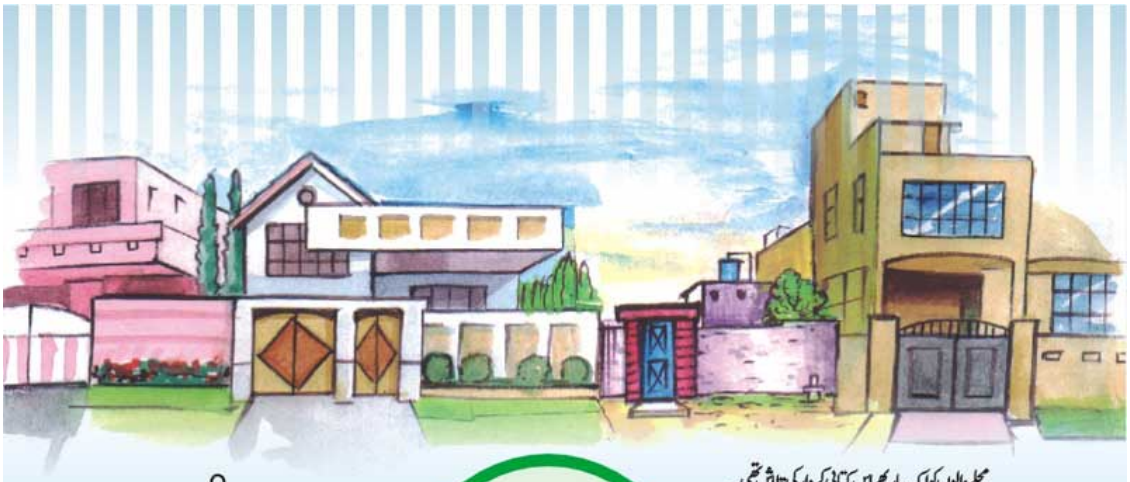

کتابی کردار

حافظ عبدالرزاق خان۔ ڈیرہ اسماعیل خان

محلے والوں کو ایک بار پھر اس کتابی کردار کی تلاش تھی۔

دریا کی طرف جانے والی مشرقی سڑک کے دونوں جانب کسی زمانے میں پھول پھلواریاں اور جامن کے باغات ہوا کرتے تھے۔ بس چند کچے گھروندے تھے جن میں من کے سچے اور وعدوں کے پکے لوگ رہا کرتے تھے۔ مادی ترقی نے ادھر کا رُخ کیا تو اس سڑک کے دونوں جانب کوٹھیاں اور بنگلے تعمیر ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا نقشہ بدل گیا۔

بنگلوں اور کوٹھیوں کے بیچ میں رہ جانے والا حافظ جی کا کچا سا مکان کسی کو نہیں جچتا تھا۔ بارہا انھیں اس مکان کے بدلے اچھی بھلی رقم کی پیش کش کی گئی لیکن وہ اپنے والد کی نشانی کو بیچنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

O

چند روز سے سارا علاقہ گندگی میں لت پت تھا۔ ہوا دراصل یہ تھا کہ گندگی اٹھانے والوں نے ہڑتال کر رکھی تھی۔ ان کے دیگر مطالبات کے علاوہ ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ دریا کی طرف جانے والی مشرقی سڑک کے دونوں جانب بنے ہوئے بنگلوں اور کوٹھیوں کے کوڑا کرکٹ اٹھانے میں ہمیں گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ لہٰذا وہ اس علاقے میں کوڑا کرکٹ ایک مقررہ جگہ پر ڈالا کریں۔ مطالبہ تو درست تھا مگر کوئی شخص بھی اپنے گھر کے سامنے اس طرح کا ”بڑا کوڑے دان“ بنوانے کے لیے تیار نہ تھا۔ ہر شخص ایک سے بڑھ کر ایک تھا تو بھلا کیوں کر اس مطالبے کو تسلیم کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ جا بجا گندگی کے لگے ڈھیر تعفن کا باعث بن رہے تھے۔

”اگر تمہاری مرضی ہو تو ہم اس مسئلے کو حل کر سکتے ہیں؟“ حافظ جی نے اپنی اہلیہ سے پوچھا۔

”وہ کیسے؟“ آمنہ کے لہجے میں تجسس تھا۔

”وہ ایسے کہ ہمارے گھر سے متصل جو دو مرلوں پر مشتمل جگہ ہے، اس میں ہم صرف اپنی بکریاں باندھتے ہیں۔ وہ بھی رات کے وقت۔ اگر اس جگہ کے سامنے ”کوڑے دان“ رکھوا دیا جائے تو کیسا رہے گا؟ سب کا بھلا ہو جائے گا۔“ حافظ جی نے تجویز دی تو آمنہ نے منہ بسورا۔

”ہوں، سب کا بھلا ہو جائے گا۔ بھلائی کے کام اور بھی بہت ہیں۔ تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے اس عمل سے تمہاری بخشش ہو جائے گی۔“

”بالکل ہو سکتا ہے کہ یہ عمل ہماری نجات کا باعث بن جائے۔“ حافظ جی نے مسکرا کر کہا تو آمنہ نے ان کو جھڑکا:

”تو پھر آپ ان بنگلے والوں کو نجات کیوں نہیں دلاتے۔ ان کے گھروں پر بننے دو ناں کوڑے دان۔“

”دیکھو لو! موقع ہے۔ شاید ہماری یہ قربانی کام آ جائے۔“ حافظ جی معنی خیز انداز سے بولے تو آمنہ سوچ میں پڑ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد بولیں:

”اچھا ٹھیک ہے، میرا کیا جاتا ہے۔ ویسے انتظامیہ اس معاملے میں دلچسپی لیتی تو مسئلہ حل ہو ہی جاتا۔“

”اللہ کی بندی! انتظامیہ بھی تو کسی خالی جگہ کو مقرر کرے گی ناں!! اور اگر خالی جگہ ہوتی تو یہ مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔“

بالآخر آمنہ مان گئیں اور اگلے روز سے دریا کی طرف جانے والی مشرقی سڑک کے دونوں اطراف کے بنگلوں اور کوٹھیوں کا کوڑا کرکٹ متعین کی گئی جگہ پر ڈالا جانے لگا۔

O

فی زمانہ لوگ کہتے ہیں کہ کوئی کسی کے ساتھ بھلائی نہ کرے اور جیسی بھلائی حافظ جی نے کی، اس سے تو اللہ کی پناہ! کبھی ہوا تیز چلتی تو حافظ جی کا گھر بدبو سے اٹ جاتا۔ گند اُڑ کر ان کے دروازے پر آ جاتا۔ حافظ جی ہمت کے کچے نہیں تھے۔ خوش دلی سے اس نیکی کے عوض ملنے والی بدبو کو سہتے۔ کبھی کبھی آمنہ سے تو تکرار ہو جاتی۔ وہ تو شکر ہے کہ آمنہ ”جراثیموں“ سے واقف نہیں تھیں، ورنہ ان کا گھر میدانِ جنگ بن جاتا۔ حافظ جی کے بچے ذرا سمجھ دار ہوئے تو بعض رشتہ دار انھیں پٹی پڑھاتے:

”تمہارے ابا بھی اللہ کی گائے ہیں اور شاید بے وقوف بھی۔ انھوں نے کیوں کر یہ ”کھتہ“ ادھر بنانے دیا۔“ بچے بھی اپنے باپ سے ناراض رہنے لگے تھے، لیکن یہ تصویر کا ایک رُخ تھا۔ کون کہتا ہے نیکی رائیگاں جاتی ہے، حافظ جی کی قربانی رنگ لائی۔ ان بڑے بڑے افسروں اور مال داروں کے نزدیک حافظ جی کی ذات اہم ہو گئی تھی۔ وہ ان کی ہر رائے کا احترام کرنے لگے تھے۔ ان میں تھوڑی بہت جتنی بھی دین داری تھی، وہ حافظ جی ہی کے سبب تھی۔ حافظ جی کی وعظ و نصیحت ہر کوئی سنتا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انڈسٹریوں کے مالکوں کے بچے حفظ کرنے لگے۔ چھ لڑکوں نے قرآنِ پاک حفظ کیا اور بہت سے دین کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ سیٹھ عمران نے تو ایک مرتبہ برملا کہا:

”بھئی ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ مولوی لوگ بڑے ضدی اور ہٹ دھرم ہوتے ہیں۔ دوسروں کو ایثار کی تعلیم دیتے ہیں اور خود عمل نہیں کرتے، لیکن حافظ جی نے ہماری غلط فہمیاں دور کر دی ہیں۔“ اب آپ ہی بتائیں نیکی رائیگاں گئی؟“

O

ایک روز آمنہ بہت خوش تھیں اور حافظ جی کا شدت سے انتظار کر رہی تھیں۔ وہ تبلیغی اجتماع پر گئے ہوئے تھے۔ لوٹے تو آمنہ نے چہک کر کہا۔

(باقی صفحہ 25 پر)

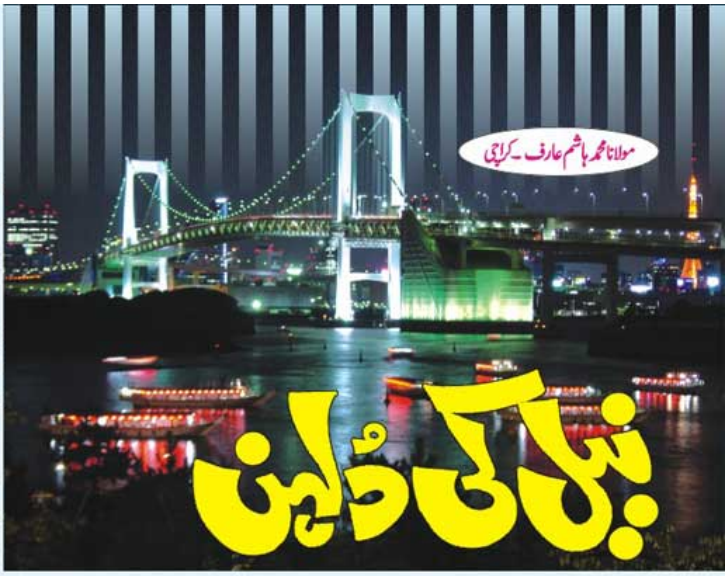

نیل کی دُلہن

مولانا محمد ہاشم عارف ۔ کراچی

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب مصر کو فتح کیا تو وہاں زمانہ قدیم سے ایک دستور جاری تھا۔ ہر سال کی بارہ تاریخ کو ایک لڑکی کو دلہن بنا کر دریائے نیل میں ڈال دیتے تھے اور اس دن کو عید قرار دے کر بڑی خوشی مناتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر دریائے نیل کو لڑکی کی بھینٹ نہ چڑھائی جائے تو وہ ناراض ہو جائے گا اور پانی نہیں دے گا۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس قبطیوں کا ایک وفد آیا۔ انھوں نے اس رسم پر عمل کرنے کی اجازت طلب کی۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اس ''خون ناحق'' کی اجازت نہ دی اور قبطیوں سے کہہ دیا:

''اسلام نے ان خرافات کو باطل کر دیا ہے۔''

''کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ دریائے نیل کا پانی اترنا شروع ہو گیا اور اہلِ مصر کو زراعت میں مشکلات پیدا ہو گئیں۔ حتیٰ کہ بعض قبیلوں نے جن کا دارومدار ہی زراعت پر تھا، مصر چھوڑ کر جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے تمام حالات حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھ بھیجے۔ ان کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک تاریخی خط دریائے نیل کے نام لکھا جس کا مضمون کچھ یوں تھا:

''اللہ کے بندے اور مسلمانوں کے امیر کی طرف سے نیلِ مصر کے نام!

امابعد: اے نیل اگر تو اپنے اختیار سے بہتا ہے تو نہ بہہ۔

لیکن اگر تیری روانی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے تو ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ تجھے جاری کر دے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہدایت کے مطابق یہ خط دریائے نیل میں ڈال دیا گیا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس سال دریائے نیل میں اس قدر پانی آیا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ (تاریخِ ملت)

دریائے نیل موجودہ قاہرہ کے عین بیچوں بیچ سے گزرتا ہے۔ شہر کے دونوں اطراف کو ملانے اور دریا کو عبور کرنے کے لیے کئی پل بنے ہوئے ہیں۔ انھی میں سے ایک پل کو ''12 اکتوبر کو بری'' کہا جاتا ہے۔ 12 اکتوبر کو مصر اسرائیل کی جنگ ہوئی تھی جس میں ابتدائی طور پر مصر نے اسرائیل کو کافی نقصان پہنچایا تھا۔ اسی واقعے کی یاد میں اس پل کو 2 اکتوبر سے منسوب کیا گیا تھا۔ اس پل پر دونوں اطراف سے ٹریفک رواں دواں تھی۔ ہم اسے پیدل بلکہ خراماں خراماں ہی عبور کرنے لگے، ہاتھ میں موجود کیمرہ کھٹا کھٹ تصویریں اپنی میموری میں محفوظ کرنے لگا۔ پل کے فٹ پاتھ پر قہوے کے اسٹال اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں جس پر بیٹھ کر لوگ قہوہ نوش جاں کرتے ہوئے دریائے نیل کے نظارے سے دل و دماغ کے سکون کا سامان کر رہے تھے۔ ہم بغیر قہوہ کے ہی دریائے نیل کو آنکھوں میں بسانے لگے۔ اسے چھو کر رگ و پے میں پیوست ہونے والی صبح کی ہوا سے لطف اندوز ہونے لگے۔ پانیوں میں موجود ہل چل میں اک عجب اطمینان تھا۔ ان موجوں پر اٹھکیلیاں کرتی کشتیاں خوب صورت باغ میں اڑتی ہوئی رنگ برنگی تتلیوں کی مانند محسوس ہو رہی تھیں۔ نجانے کتنی دیر میں اس نظارے میں کھویا رہا۔ خیالات کے گھوڑے اپنی نگاہوں سے نکل کر تاریخ کے صفحات میں سرپٹ دوڑنے لگے۔ تمام واقعات ایک فلم کی صورت میں دماغ میں چلنے لگے۔ کافی دیر بعد جب ایک قسم کا اطمینان اور سیرابی سی محسوس ہوئی تو اپنی اگلی منزل کی طرف قدم اٹھنے لگے۔

ہماری اگلی منزل ''برج القاہرہ'' یعنی قاہرہ ٹاور تھی۔ یہ کوئی قدیم عمارت تو نہیں، لیکن قاہرہ بلکہ براعظم افریقہ کی سب سے بلند ترین عمارت ہے۔ اس کی بلندی 187 میٹر ہے۔ اس کا ڈیزائن مصر کے قومی پھول ''کنول'' کی طرح کا ہے جب کہ مصر کے قدم مشہور پودے پیپرس (Papyrus) کی طرح ہے۔ یہ پودا زمانہ قدیم سے مصر میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے ایک قسم کا کاغذ بنایا جاتا تھا اور پھر یہ کاغذ مختلف چیزوں میں استعمال ہوتا تھا۔

بلند ترین عمارت ہونے کی وجہ سے قاہرہ ٹاور سے پورے قاہرہ کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک تحقیق دان اور فوٹو گرافر کے لیے اس سے بڑی دلچسپی کیا ہو گی کہ ایک ہی جگہ کھڑے ہو کر ہر جگہ کا معائنہ کر سکتے ہیں۔

چلتے چلتے دیکھا کہ سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور پھر چند میٹر کے بعد فوراً ہی دوبارہ دونوں حصے یکجا ہو گئے۔ درمیانے حصے میں ایک بہت ہی قدیم درخت اگا ہوا تھا جس کے تنوں سے نکلنے والی جڑیں بھی زمین میں درخت کی مانند پیوست تھیں۔ اس درخت پر لگے کتبے کے مطابق یہ درخت 1867ء میں لگایا گیا تھا، گویا 150 سو سالہ قدیم درخت تھا۔

اب ہم برج القاہرہ کے داخلی دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ اوپر جانے کے لیے ٹکٹ تھا، جو مصریوں کے لیے بیس پاؤنڈ جب کہ غیر مصریوں کے لیے 70 پاؤنڈ، چونکہ یہ تفریق قانونی تھی، لہٰذا اس میں چوں چراں کی بالکل گنجائش نہیں تھی، خاموشی سے دو ٹکٹ لیے اور لفٹ کی طرف بڑھے۔ کچھ ہی دیر میں لفٹ کا دروازہ کھلا اور لفٹ آپریٹر نے اندر آنے کا کہا۔ ہمارے ساتھ مصری طالبات کا ایک گروپ بھی لفٹ میں سوار ہوا۔ ماشاء اللہ تمام طالبات نے اسکارف پہنا ہوا تھا جب کہ ایک طالبہ نے مکمل حجاب کیا ہوا تھا۔

لفٹ کا دروازہ بند ہوتے ہی لفٹ آپریٹر نے ہمیں گہری نظروں سے دیکھا اور پھر پوچھا:

''من این'' یعنی کہاں کے رہنے والے ہو۔ میں نے جواب دیا۔ پاکستان۔ اس کے جواب میں اس نے طالبات کو مخاطب کر کے اپنی مصری زبان میں کچھ کہا جو ہماری سمجھ میں نہیں آیا، لیکن ان طالبات نے زبردست قہقہہ لگایا۔ ان کے اس طرزِ عمل سے ہمیں اپنی ہتک محسوس ہوئی، لیکن کچھ کر نہیں سکتے تھے کہ ایک طرف تو خواتین، دوسرا اتنا مختصر سفر کہ لفٹ چند لمحوں میں ہی مطلوبہ منزل تک پہنچ گئی اور ایسی بھی کوئی بڑی بات نہ تھی کہ جس کو ذہن میں جگہ دیتے۔ مٹی پاؤ!

لفٹ نے ہمیں سب سے آخری منزل پر اتار دیا۔ وہاں ایک خوب صورت ریستوران بنا ہوا ہے جو متحرک ہے، یعنی گھومتا ہے اور 70 منٹ میں اپنا چکر مکمل کرتا ہے۔ اس ریستوران کے اوپر ایک گیلری بنی ہوئی ہے جہاں سے آپ کھلی فضا میں پورے قاہرہ کو دیکھ سکتے ہیں۔

فوراً اوپر گئے اور پھر چاروں طرف گھوم گھوم کر بہت سی تصاویر لیں۔ دریائے نیل بالکل ہمارے دامن میں

تھا۔ مشرق کی طرف جبل المقطم ،قلعہ صلاح الدین ایوبی، قاہرہ میوزیم اور دیگر عمارات نظر آرہی تھیں جب کہ مغرب کی طرف اہرام مصر پرچھائیوں کی صورت میں جلوہ گر تھے۔ اوپر سے لوگ بونے اور گاڑیاں کھلونوں کی صورت میں نظر آرہی تھیں۔ کافی دیر تک ہم نظارے کرتے رہے جب تھک گئے تو تھوڑی دیر ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ اس دوران ایک شخص ہاتھ میں کیمرہ لیے ہماری طرف آیا اور ہم سے کہا کہ میں ایک پروفیشنل فوٹوگرافر ہوں اور قیمت کے عوض لوگوں کو تصاویر کھینچ کر دیتا ہوں۔ اس کے جواب میں میں نے بیگ سے اپنا کیمرہ نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔ کیمرے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

بقیہ

کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آئے

مجھ سے ہی ایک حسابی سوال کر دیا:

”سر! آج میرا آخری پرچہ ہے۔ اس سے پہلے پرچوں کے نمبروں کا حساب میں نے لگایا ہے۔ وہ 540 بنتا ہے۔ اگر آپ اس پرچے میں مجھے 60 نمبر دے دیں تو میرے پورے 600 نمبر ہو جائیں گے۔ اُمید ہے آپ میری درخواست منظور فرما کر مجھ سے دعائیں لیں گے۔ بس 60 نمبروں کا سوال ہے۔“

آٹھ کو ساٹھ! آٹھ نمبروں کو ساٹھ بنانے کے لیے اُن کے اس التجائیہ سوال کی صرف ”س“ ہی کی ضرورت تھی، لیکن 8 کو 60 بنانا میرے بس میں نہیں تھا۔ اس لیے ان کے حسنِ طلب کی داد دینے پر ہی اکتفا کیا۔

ویسے انھیں کون بتاتا کہ ایک وقت آئے گا جب خود میری تحریر 600 نمبر میں جگہ پانے کے لیے کسی اور ممتحن (مدیر ”بچوں کا اسلام“) کی نظرِ کرم کی اُمید وار ہوگی۔

ایک پرچے کے پہلے صفحے پر صرف دو الفاظ تحریر تھے: ”خالی پیریڈ“ دوسرا صفحہ پلٹا تو اس پر بھی یہی الفاظ تھے۔ تیسرے پر بھی ”خالی پیریڈ“ لکھا تھا۔ چوتھے صفحے پر یہ تحریر تھی:

”ہمارے پہلے تین پیریڈ عموماً خالی ہوتے ہیں۔ اس کے بعد صرف ایک پیریڈ ہوتا ہے۔ چوتھا، پانچواں، چھٹا، ساتواں، یعنی ایک دن میں صرف ایک پیریڈ۔ وجہ یہ ہے کہ پرنسپل صاحب کبھی کبھار آتے ہیں اور پروفیسر صاحبان باقاعدگی سے ایک دن میں ایک یا دو ہی آتے ہیں۔“

اس تحریر کے نیچے ایک ٹرک کی تصویر تھی جس کے ماتھے پر یہ لکھا تھا:

نہ انجن کی خوبی نہ کمالِ ڈرائیور
چلا جا رہا ہے خدا کے سہارے

یہ شعر ہمارے کالج پر بالکل فٹ آتا ہے، بلکہ جس ٹرک پر میں نے یہ شعر لکھا دیکھا تھا، اُس کی حالت ہمارے کالج سے کافی بہتر تھی۔

نیچے کالج اور اُس قصبے کا نام بھی درج تھا جس میں وہ کالج ”قائم“ تھا۔ اس کے بعد پھر تین چار صفحوں پر مسلسل ”خالی پیریڈ“ کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

ایک طالب علم نے آخری دو صفحوں کے سوا پوری جوابی کاپی اپنی نگارشات سے مزین کی تھی، لیکن وہ نگارشات کیا تھیں؟ سوالیہ پرچے سے دس کے دس سوالوں کی عبارت اسی ترتیب سے بار بار نقل کر دی تھی۔ یوں یہ پرچہ:

بیکار مباش کچھ کیا کر
کپڑے ادھیڑ ادھیڑ کر سیا کر

کی عملی تفسیر بن گیا:

ایک دیانت دار، سچے اور سادہ لوح طالب علم نے چند سوال حل کرنے کے بعد ایک باہر سے سپلائی کیا ہوا کاغذ جسے امتحانی زبان میں ”بوٹی“ کہتے ہیں، لیکن وہ اپنے سائز کے اعتبار سے ”بُوٹا“ کہلانے کا زیادہ مستحق تھا، جوابی کاپی میں ہی نتھی کر دیا اور ساتھ ایک نوٹ لکھ دیا کہ ”جناب باقی سوالوں کے جواب تو میں نے ”پڑھ کر“ لکھ دیے تھے، لیکن یہ جواب مجھ سے پڑھا نہیں جا رہا، اس لیے یہ کاغذ نتھی کر رہا ہوں۔ آپ اسی پر نمبر لگا دیجیے۔“

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اَے خدا

اس پر مجھے ایک انگریزی جاسوسی کہانی کا وہ کردار یاد آ گیا جو اپنے چار دشمنوں کو باری باری فائر کر کے قتل کر دیتا ہے اور پانچویں دشمن پر فائر کرنے لگتا ہے تو اس کے پستول میں گولیاں ختم ہو چکی ہوتی ہیں۔ وہ موقع پر پہنچنے والے پولیس انسپکٹر کو اپنا خالی پستول دیتے ہوئے کہتا ہے:

”انسپکٹر صاحب! اس کو لوڈ کر کے میرے اس پانچویں دشمن کو بھی ختم کر دیجیے۔“

ایک طالب علم نے پرچہ حل کرنے کے بعد آخر میں ایک عجیب اور خوف ناک قسم کی اپیل کی:

”اگر آپ نے میرا پرچہ توجہ سے اور پوری طرح پڑھ کر چیک نہیں کیا تو مہربانی فرما کر اس پر نظر ثانی کر لیجیے۔ شاید یہ آپ کی زندگی کا آخری پرچہ ہو۔“

مجھے تو یہ عبارت پڑھتے ہی جھرجھری آ گئی۔ بسوں اور ویگنوں میں اس قسم کی عبارت سے کئی بار واسطہ پڑ چکا تھا جو عموماً ”شاید یہ تیری زندگی کا آخری سفر ہو“ پر ختم ہوتی ہے، لیکن پرچے پر اس قسم کی عبارت میں نے پہلی مرتبہ پڑھی تھی۔ لکھائی بھی خوب صورت تھی۔ میں سنبھل گیا۔ اس مختصر اور پُر اثر اپیل نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں پرچے پر نظر ثانی کروں۔ نمبر تو میں لگا چکا تھا، لیکن میزان ابھی نہیں کیا تھا، چنانچہ میں نے نئے سرے سے باقاعدہ پڑھ کر اور توجہ سے نمبر لگائے۔ اب میزان کیا تو پینسٹھ (65) نمبر بنے جب کہ پہلے پچپن (55) نمبر بنے تھے۔ گویا پہلے کے مقابلے میں اب دس نمبر زیادہ بنے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر طالب علم یہ اپیل نہ لکھتا اور میں اسی طرح اُس کا پرچہ جانچتا جس طرح پرچے جانچے تھے تو اُسے دس نمبر کم ملتے۔ گویا اس کی ایک دو نہیں بلکہ پورے دس نمبروں کی حق تلفی ہوتی۔ صرف نمبروں کا فرق نہ پڑتا بلکہ فرسٹ ڈویژن کی بجائے سیکنڈ ڈویژن بنتی۔ اب جوں جوں اس کی اپیل پر غور کرتا گیا، مجھے خوف سے پسینہ آتا گیا۔ اگر میں اس کے پرچے پر نظر ثانی نہ کرتا تو وہ اپنے دس نمبروں کے جائز حق سے محروم ہو جاتا اور اُس کی حق تلفی کا ذمہ دار میں اور صرف میں ہوتا اور قیامت کے روز اگر وہ مجھ سے ان دس نمبروں کا مطالبہ کرتا تو میں اُسے کہاں سے دیتا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ اس امتحان کے اس سے پہلے جو ساٹھ ستر پرچے میں جانچ چکا ہوں، اُن کا بھی یہی حال ہوگا۔ میں نے ان پرچوں پر بھی نظر ثانی کی تو کچھ پرچے ایسے نکل آئے جن میں میں نے کم نمبر دیے تھے۔ دو یا تین طالب علم تو چند نمبروں کے اضافے سے فیل سے پاس بھی ہو گئے۔ اسی طرح کچھ پرچے ایسے بھی تھے جو جلدی میں اصل سے زیادہ نمبر لے گئے تھے۔ ان پرچوں کو تو میں نے درست کر دیا، لیکن اس سے پہلے امتحانوں کے جو بے شمار پرچے میں اب تک جانچ چکا تھا، اُن سب کو کیسے درست کروں گا۔ اُن میں میں نے طلبا کی جو حق تلفیاں کی ہیں، انھیں ان کا حق کیسے واپس کروں گا؟ اس سے آگے سوچنے سے مجھے خوف آنے لگا اور میں نے توبہ کرنے کے بعد عہد کیا کہ آئندہ توجہ اور احتیاط سے اپنا فرض ادا کروں گا۔

اگر ہم سب یہ سوچ لیں کہ جو فرض ہم ادا کر رہے ہیں جو ذمے داری ہم نبھا رہے ہیں اور جس کی ہمیں پوری ادائیگی کی جا رہی ہے، کہیں یہ فرض، یہ ذمے داری ادا کرنے کا آخری موقع نہ ہو اور شاید اس کے بعد ہمیں یہ موقع نہ مل سکے، تو ہم نہ جانے کتنے مظلوموں اور کتنے حق داروں کی حق تلفیاں کرنے سے بچ سکتے ہیں، لیکن اگر ہم نفس اور طمع کے اسیر ہو کر اپنے فرض اور ذمے داری سے کوتاہی کرتے رہے تو قیامت والے دن ان ساری حق تلفیوں کی تلافی کیسے کر پائیں گے؟

بقیہ کتابی کردار

"سہیل کے ابو! مجھے معاف کر دینا۔ آیندہ "کوڑے دان" کے معاملے پر آپ کا ہرگز دل نہیں دکھاؤں گی۔"

"وجہ؟" حافظ جی نے وضاحت چاہی تو آمنہ تفصیل بتانے لگی۔

"گزشتہ شب میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک انتہائی شان دار محل ہے۔ ایک ایسی خوشبودار ہوا چل رہی ہے جیسی میں نے کبھی نہ سونگھی۔ اس نے چاروں طرف سے اس محل کو گھیر رکھا ہے۔ اچانک اس محل کا دروازہ کھلتا ہے تو آپ نمودار ہوتے ہیں۔ آپ کی جوانی لوٹ آئی ہے۔ آپ مجھے اپنی طرف بلاتے ہیں تو گیٹ پر کھڑے خدام یک دم آگے بڑھ کر مجھے روک دیتے ہیں اور آپ سے مخاطب ہوتے ہیں۔"

"یہ محل صرف تمہارے لیے ہے اور یہ خوشبو اس بدبو کا صلہ ہے جو تم دنیا میں سہتے رہے۔ تم نے وہ نیکی کی جو ہر ایک سے ہونا ناممکن ہے۔

اسی دوران میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ بس میں خوش ہوں۔ میرے رب نے مجھے دکھا دیا۔"

"دیر آید درست آید۔" کہہ کر حافظ جی مسکرانے لگے۔

O

دریا کی طرف جانے والی مشرقی سڑک کے دونوں اطراف بنے بنگلوں اور کوٹھیوں کے مکیں چند روز سے پھر پریشان تھے۔ گند اٹھانے والوں نے ہڑتال کی ہوئی تھی۔ تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی تھی۔ سہیل نے کمیٹی میں درخواست دے کر "کوڑے دان" کو اپنے گھر سے ہٹوا دیا تھا اور دوسرا کوئی بھی اپنے گھر کے آگے "کوڑے دان" نصب کرانے کو تیار نہ تھا۔ سیٹھ عمران نحیف و نزار ہو چکے تھے۔ سہیل کو سمجھانے لگے تو وہ بھپر گیا:

"انکل! آپ یہ نیکی کیوں نہیں کر لیتے۔ ابا جی نے جو کرنا تھا وہ کر گئے۔ ہم سے یہ نیکی نہیں ہوتی اور نہ ہی میری اہلیہ کو اماں جیسا کوئی خواب نظر آئے گا۔"

اس کا ٹکا سا جواب سن کر سیٹھ عمران خلاء میں گھورنے لگے۔ شاید وہ خلاء میں اس "کتابی کردار" کو ڈھونڈ رہے تھے جس کا ہماری مذہبی کتابوں میں "اسلام" ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔

مُعمّہ

محسن منظور۔راولپنڈی

البرٹ آئن سٹائن کو بیسویں صدی کا سب سے عظیم سائنس دان مانا جاتا ہے۔ اُس کی علمی تحقیقات اور نظریات کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اُسے نوبل پرائز بھی دیا گیا۔ آئن سٹائن نے طبیعات یعنی Physics میں بہت نمایاں کام کیا۔ آئن سٹائن اپنے وقت سے بہت آگے تھا۔ اُس کے پیش کیے گئے نظریات اُس کے مرنے کے تقریباً نصف صدی بعد تحقیق کر کے ثابت کیے گئے۔ آئن سٹائن کو اپنے نظریات اور تحقیق پر بہت فخر تھا اور اُسے اُن کے یقینی ہونے کا اس حد تک بھروسہ تھا کہ وہ کہا کرتا تھا کہ میرے نظریات اگر حقائق سے مطابقت نہ رکھیں تو میں اپنے نظریات نہیں بدلوں گا، بلکہ حقائق کو بدل دوں گا۔ آئن سٹائن کی تحقیق کا زیادہ تر موضوع توانائی، مادہ، کائنات اور ان سب کی تخلیق تھا۔ اس دور میں وہ تمام مسائل جن کا تعلق کائنات سے تھا۔ آئن سٹائن نے ان کا حل بھی پیش کیا اور اپنے تمام ہم عصر سائنس دانوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ مشکل اور پیچیدہ مسائل کو باآسانی حل کر کے آئن سٹائن نے اپنے آپ کو وقت کا عظیم ترین سائنس دان ثابت کیا۔ اتنی زیادہ کامیابیوں کے باوجود ایک ایسا معمہ تھا کہ جہاں پہنچ کر آئن سٹائن بھی لاجواب ہو گیا۔ اپنی تمام تر تحقیق اور علم کے باوجود وہ اس مسئلے کو حل نہ کر سکا۔ اس مسئلے کو بیان کرنے سے پہلے اب تھوڑی دیر کے لیے سوچیں کہ آخر وہ کیا مسئلہ ہوگا کہ جس کے لیے آئن سٹائن جیسے عظیم سائنس دان کو بھی ہار ماننا پڑی۔ ہر انسان کے لیے اُس کی عقل کے مطابق بڑا یا چھوٹا مسئلہ ہوتا ہے۔ اب جو مسئلہ عظیم ترین سائنس دان کو پیش آیا، وہ بھی عظیم ترین ہی ہوگا۔ مسئلے کو سمجھانے کے لیے ایک مثال لیجیے۔

آپ اپنی گاڑی کو صبح سٹارٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سٹارٹ نہیں ہوتی۔ گاڑی میں پٹرول، CNG، تیل بیٹری وغیرہ سب کچھ ہے اور وہ صحیح طریقے سے سٹارٹ بھی کر رہے ہیں، مگر گاڑی پھر بھی سٹارٹ نہیں ہو رہی۔ آپ گاڑی کے اچھے سے اچھے مکینک کو بلاتے ہیں۔ اُس کی سمجھ میں بھی گاڑی کا مسئلہ نہیں آتا۔ پھر آپ مجبور ہو کر گاڑی بنانے والے کے پاس جائیں گے اور وہ آپ کو آپ کے مسئلے کی طرف صحیح راہنمائی کرے گا۔ اب ہم آتے ہیں اصل مسئلے کی طرف۔ آئن سٹائن نے جب اپنی تحقیق اور نظریات کی بنیاد پر کائنات کے نظام کو سمجھنے کی کوشش کی تو وہ شدید حیرت اور فکر میں مبتلا ہو گیا۔ اُس کے مطابق گر اس کی تحقیق اور نظریات صحیح ہیں (جو کہ تھے بھی) تو اس کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ کائنات کے تمام بڑے ستارے اور کہکشائیں ایک دوسرے کی طرف کششِ ثقل کی وجہ سے کھنچنا شروع کریں اور ایک ایسا وقت آئے کہ وہ ایک دوسرے سے ٹکرا کر تباہ ہو جائیں، مگر حقیقتاً کائنات میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ تمام کہکشائیں اپنی اپنی جگہ موجود ہیں اور ایک دوسرے کی طرف سفر نہیں کرتیں، لیکن ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ آئن سٹائن کے پاس اُس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ آئن سٹائن نے اس کے متعلق بہت سوچا اور بہت اندازے لگائے مگر وہ ہر صورت ناکام رہا۔ اس عظیم معمے کو حل کرنے کے لیے آئن سٹائن کو اپنے وقت کے ایک اور سائنس دان ایڈون ہیوبل کی خدمات حاصل کرنا پڑی۔ ہیوبل نے امریکا کی سب سے زیادہ طاقتور دوربین کی مدد سے 1923 میں یہ ثابت کیا کہ کائنات اپنے موجودہ حجم (جس کا اُس وقت اندازہ کیا گیا تھا) سے بھی کہیں زیادہ وسیع ہے اور کائنات میں موجود کہکشائیں ایک دوسرے سے دور ہوتی جا رہی ہیں اور اُن کے دور ہونے کی رفتار اتنی تیز ہے کہ وہ ایک دوسرے کی طرف کششِ ثقل ہونے کے باوجود کھنچتی نہیں ہیں۔ ایڈون ہیوبل کی اس دریافت کو بیسویں صدی کی چند اہم ترین دریافتوں میں سے ایک اہم دریافت مانا جاتا ہے اور اسے لا آف ایکس پنشن آف یونیورس (Law Expansion Of Universe) کا نام دیا۔ اسی دریافت کی وجہ سے سائنس دانوں نے اس بات کا اندازہ لگایا کہ کائنات اپنے جسم کے اطراف میں بہت تیزی سے پھیل رہی ہے۔ آئن سٹائن کو اپنے معمے کا حل مل گیا، مگر وہ پھر بھی یہ ثابت نہ کر سکا کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ آئن سٹائن اور دیگر بہت سے سائنس دانوں نے اس دریافت کی وجوہات بیان کرنے کے لیے بہت سے نظریات پیش کیے جیسے بگ بینگ (Big Bang) نظریہ وغیرہ، مگر کوئی بھی نظریہ اس دریافت کے جواب کے لیے دیرپا ثابت نہ ہوا۔ اب دیکھیے! اللہ رب العالمین کا جواب جو اس مسئلے میں پیش کیا گیا، سورۃ الذّریات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اور ہم نے اس آسمان کو بنایا اور ہم ہی اسے وسعت دیے جا رہے ہیں۔"

یعنی اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کا حل آج سے 1500 سال پہلے ہی قرآنِ مجید میں دے دیا تھا۔ نظریۂ وسعتِ کائنات اسلامی ممالک کی کتب میں نہیں ہے اور نہ ہی اسکولوں میں پڑھایا جاتا ہے، شاید اس لیے کہ مسلمان قرآن کی طرف مائل نہ ہو جائیں اور کہیں یورپ کی تقلید نہ چھوڑ دیں۔ اب یہ ذمے داری مسلمان اساتذہ کی ہے کہ وہ مسلمان بچوں میں یہ شعور پیدا کریں کہ اسلام ہی ہمارا راہنما ہے اور اسی میں ہماری بقا ہے۔ (حوالہ: ووا: Time 100)

سائبان

شازیہ نور۔ لاہور

وہ اپنے ماں باپ کے لیے ایک آزمائش تھا۔ اولاد تو جیسی بھی ہو، والدین کو عزیز ہوتی ہے، لیکن اس کا وجود کچھ کر والدین، بلکہ خاص طور پر اس کی ماں کے دل پر چھریاں چلاتی تھیں۔ وہ معذور تھا۔ جسمانی طور پر بھی اور کچھ ذہنی طور پر بھی، نہ وہ خود کھا سکتا تھا، نہ کپڑے بدل سکتا تھا۔ چلنا پھرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ وہ بستر پر پڑا رہتا یا کرسی پر بٹھا دیا جاتا، ماں نے اسے ''سبحان اللہ'' کہنا سکھا دیا تھا۔ وہ سبحان اللہ! سبحان اللہ! پڑھتا رہتا، کبھی روتا تو کبھی ہنستا، روتا اس وقت تھا جب کوئی تکلیف ہوتی۔ دس سال کی عمر میں اس کی ذہنی قابلیت تین سال کے بچے جتنی تھی۔ اس کے بہن بھائی سب بڑے تھے، لیکن کوئی اس کا کام نہیں کرتا تھا۔ صرف ماں تھی جو اس کے سارے کام کرتی، اسے کھلاتی، پلاتی اور صاف ستھرا رکھتی۔

جب وہ پیدا ہوا تھا تو سب گھر والے بہت خوش تھے، کیونکہ اس کی پیدائش کے فوراً بعد ہی اس کے باپ صفدر خان کی ترقی ہوگئی تھی۔ صفدر خان کی تنخواہ دوگنی ہوگئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد مزید ترقی ملی۔ اب ان کے پاس خوب صورت گھر، گاڑی اور دنیا جہان کی تمام نعمتیں آگئی تھیں، لیکن ان تمام خوشیوں میں اس کا ''معذور وجود'' سب کی نگاہوں میں کھٹکتا تھا۔

بھائی اسے بھائی کہتے ہوئے شرماتے تھے، بہنیں اس سے کھیلنے سے کتراتی تھیں۔ باپ اپنا پیسہ اس کے علاج پر لگانے کو فضول خرچی سمجھنے لگا تھا۔ پیدائش کے وقت تو وہ صحیح تھا مگر ایک روز جب کہ وہ پانچ ماہ کا تھا، اس کی ماں اسے گود میں لیے کھڑی تھی کہ پیچھے سے بچے بھاگتے ہوئے آئے اور ماں سے ٹکرا گئے۔ وہ ننھا سا وجود ایک دم سے ہاتھوں سے نکل کر دور جا گرا، ماں نے بھاگ کر اسے اٹھایا۔ وہ رو رہا تھا، بظاہر کوئی چوٹ نہیں تھی۔ ماں مطمئن ہوگئی۔ مگر کچھ دنوں بعد اندازہ ہوا کہ اس کے ہاتھ پاؤں حرکت نہیں کر رہے۔ وہ مالشیں کرتی رہی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ اس کے دماغ پر سوزش ہے۔ اسے دوائیں وغیرہ دی گئیں مگر بے سود۔ وقت گزرتا گیا۔ پیسے کی ریل پیل نے سب کا ذہن گویا ماؤف سا کر دیا تھا۔ ایک ماں تھی جو اس کا غم دل پر لیے پھرتی تھی۔

سب بچے سکولوں، کالجوں میں پڑھ رہے تھے اور وہ صرف چند جملے اپنی ماں سے سیکھ سکا تھا۔ اس اثنا میں صفدر خان خود مل، مالک بن چکا تھا۔ اس کے باوجود سب کو وہ اور زیادہ بوجھ لگنے لگا تھا۔ اب تو اس کے بڑے بھائی بھی اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔

اتفاقاً صفدر خان کو بیرونِ ملک میں بہت اچھی نوکری کی پیش کش ہوئی۔ بڑے بیٹے نے اس کی جگہ موجودہ مل سنبھالی اور صفدر خان مزید کمانے کی دھن میں بیرونِ ملک چلا گیا۔

ایک روز اس کی ماں کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اسے ہسپتال لے کر جانا پڑا۔ کچھ ضروری ٹیسٹ وغیرہ کی وجہ سے اسے ہسپتال میں ہی روک لیا گیا۔ اس کے ساتھ اس کی بیٹیاں اور ایک بیٹا بھی تھا۔ گھر میں وہ اکیلا تھا۔ ملازموں کے پاس، اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا، اسے ماں یاد آ رہی تھی۔ ایک ملازم نے اس کے بڑے بھائی کو فون کر دیا کہ شرجیل صاحب کھانا نہیں کھا رہے۔ بڑے بھائی راحیل نے یہ سن کر ہمدردی کرنے کے بجائے غصہ کیا اور گھر آ کر سزا کے طور پر شرجیل کو اس کی کرسی سمیت سڑک پر چھوڑ آیا۔

کچھ دیر بعد ہی اس کی ماں کو لے کر باقی بہن بھائی گھر واپس آ گئے۔ ماں نے آتے ہی شرجیل کا پوچھا:

''شرجیل کہاں ہے؟ اس نے کھانا کھایا؟''

''امی آپ فکر نہ کریں، عثمان بابا نے اسے کھانا کھلا دیا ہوگا، آپ آرام کریں۔''

راحیل نے اپنی ماں کو دلاسہ دینے کی کوشش کی، لیکن ماں کی ممتا کو چین نہ آیا، اس نے ملازموں کو بلا کر ان سے پوچھا۔ سب کن انکھیوں سے راحیل کو دیکھتے رہے۔ ماں کو شک گزرا اور اس نے سختی سے پوچھا۔ ''راحیل سچ بتاؤ، شرجیل کہاں ہے؟''

''امی وہ تنگ کر رہا تھا۔ میں اس کا دل بہلانے کے لیے اسے سڑک پر چھوڑ آیا تھا۔''

ماں نے ملازموں کو دوڑایا۔ سب ملازم منہ لٹکا کر واپس آ گئے۔ شرجیل کہیں نہیں ملا۔

ماں کی طبیعت پھر سے خراب ہوگئی۔ اسے غشی کے دورے پڑنے لگے، سب گھر والے پریشان ہوگئے، وہ رات سب کی روتے دھوتے گزری، مسجدوں میں اعلان کرایا گیا، گلی گلی ڈھونڈا گیا مگر شرجیل کا پتا نہ چل سکا۔ دوسرے دن ہی صفدر خان کا فون آیا کہ اس کی ملازمت ختم ہوگئی ہے، جس ادارے کے ساتھ وہ کام کر رہا تھا، وہ جعلی نکلا۔ اس دوسرے غم نے سب کو مزید پریشان کر دیا۔

شرجیل کی تلاش جاری تھی، وہ جب سے غائب ہوا تھا، گھر میں سکون نام کی چیز بھی غائب ہوگئی تھی۔ ابھی وہ بے چینی کی کیفیت سے نکل نہیں پا رہے تھے کہ ایک رات مل میں آگ لگ گئی اور ایسی لگی کہ سب کچھ بھسم ہوگیا۔

صفدر خان سمیت سب گھر والوں کو یہ صدمہ برداشت کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ ماں نیم بے ہوشی کی کیفیت میں ''شرجیل! شرجیل پکار رہی تھی اور صفدر خان دل پکڑے بیٹھا تھا اور شرجیل کے بہن بھائیوں کو اب احساسِ ندامت ہو رہا تھا کہ وہ بھائی جسے وہ اپنے لیے بوجھ سمجھتے تھے، وہی تو ان کی خوشیوں کا سائبان تھا۔ (سچے واقعہ سے ماخوذ)

آخری قسط

تصویر کی دھمکی

اشتیاق احمد

میں نے اس کے پستول پر فائر کر دیا... بعد میں یہ کانسٹیبلوں کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کمرے سے نکل گیا... ہم نے پھاٹک تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائی، لیکن ہمیں دور دور تک کوئی بھاگتا نظر نہیں آیا... ساری کوٹھی میں بھی کوئی نقاب پوش نہیں ملا... بس چھت پر ایک نائیلون کی رسی کی سیڑھی ضرور لٹک رہی تھی، جس سے یہ اندازہ لگایا گیا کہ نقاب پوش اس رسی کے ذریعے فرار ہو گیا، گویا اس نے فرار ہونے کا پہلے انتظام کر رکھا تھا، لیکن اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عابد رئیسانی نے چھت پر سیڑھی اس لیے لٹکا دی تھی کہ یہ خیال کر لیا جائے، نقاب پوش اس راستے سے فرار ہوا ہے، لیکن دراصل اُسے تو فرار ہونے کی ضرورت ہی نہیں تھی... اُسے تو صرف اتنا کرنا پڑا تھا کہ سردار ہارون کے کمرے سے فرار ہو کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور لباس بدل کر دوسرے لوگوں میں آ کر شامل ہو گیا... اب چونکہ ہم ان دونوں کی تصویروں والے لفافے کے بارے میں گفتگو لفظ بہ لفظ سن چکے تھے اور میں نے انوار صدیقی صاحب کے سامنے سردار صاحب سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اب وہ کچھ نہ چھپائیں اور لفافے کے بارے میں بتا دیں، لہٰذا سردار صاحب بتانے پر مجبور ہو گئے... لیکن اس سے پہلے کہ کچھ بتاتے، عابد رئیسانی نے انھیں زہر سنگھا دیا... وہ اُن کے قریب ہی تھے اور شاید رومال پر زہر لگا کر پہلے ہی لے آئے تھے... کسی بہانے سے انھوں نے رومال سردار صاحب کی ناک سے چھو دیا ہو گا اور اس طرح یہ تیز زہر ان کے سانس کے ساتھ اندر چلا گیا اور وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی ختم ہو گئے... آج صبح معلوم ہوا کہ ان کی موت زہر سے ہوئی ہے، تو میرا ذہن فوراً عابد صاحب کی طرف گیا، لیکن میں نے جان بوجھ کر انھیں نظر انداز کیے رکھا اور تجوری کی تلاشی شروع کر دی... میں جانتا تھا، عابد رئیسانی چھپ کر ہماری کارروائی کو ضرور دیکھے گا اور جب ہم تصویروں کا لفافہ برآمد کر لیں گے تو اسے حاصل کرنے کے لیے ضرور آئے گا، چنانچہ یہی ہوا اور اب عابد رئیسانی صاحب بندھے پڑے ہیں... میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ یہ ان کا فرضی نام ہے... اصل نام نہ جانے کیا ہے... بیگم صاحبہ، کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ عابد رئیسانی نام کا کوئی شخص سردار صاحب کا دوست تھا؟''

''جی ہاں، وہ ایک دوسرے شہر میں رہتا ہے اور سردار صاحب سے اس کی خط و کتابت تھی۔''

''بس تو پھر ضرور یہی بات ہے... اس نے کسی طرح ان کے آپس کے تعلقات کا پتا چلا لیا اور پھر یہ دوسرے شہر پہنچ گیا... شاید یہی وہ وقت تھا، جب عابد رئیسانی صاحب ہمارے جاسوسوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے اور کافی دنوں غائب رہے تھے... ظاہر ہے، دوسرے شہر میں رہتے ہوئے انھوں نے اصل عابد رئیسانی کی حرکات اور سکنات کا جائزہ لیا ہو گا... عادات کا مشاہدہ کیا ہو گا، تب کہیں جا کر اس کا میک اپ کرنے میں کامیاب ہوئے ہوں گے... نہ جانے انھوں نے اصل عابد رئیسانی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو گا... یہ تو خیر معلوم کرنا پڑے گا کہ ان پر کیا گزری... یہ عابد رئیسانی کے رُوپ میں سردار ہارون سے ملنے اور کچھ دن یہاں ٹھہرنے کے بہانے آ گئے... مطلب یہ تھا کہ لفافہ اڑانے کے امکانات پیدا ہو جائیں... دشمن ملک کے جاسوس اردگرد سراغ لگاتے پھر رہے تھے اور انھوں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ تصویروں کا لفافہ صرف اور صرف سردار ہارون کے گھر میں ہے... اس سلسلے میں انھوں نے ضرور آس پاس کے تمام لوگوں کے حالات معلوم کیے ہوں گے، عادات معلوم کی ہوں گی، چنانچہ یہاں آنے کے بعد انھوں نے جب اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ ایک قفل شکن جیل سے رہا ہو گیا ہے تو انھوں نے سوچا کہ پہلے اس قفل شکن سے تجوری کھلوا کر دیکھی جائے... انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ ترکیب میں نے چارے کے طور پر اختیار کی تھی... تاکہ اس غیر ملکی جاسوس کا پتا چل سکے، اور پتا چل گیا... اس کے بعد تو جو کچھ ہوا، وہ آپ کو معلوم ہی ہے... اب مجھے اتنا اور بتانا ہے کہ میں نے یہ سب اندازے کس طرح لگائے... یہ بات تو ہمارے جاسوس نے معلوم کر لی تھی کہ ہمارا جاسوس قصبہ بلوشاں میں ہی کہیں گم ہوا ہے... اس کے بعد انھیں یہ اطلاع ملی کہ ایک غیر ملکی جاسوس کو خاص طور پر وہ لفافہ حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے اور ہمارے جاسوس بھی اس کی نگرانی کر رہے ہیں... پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا... میں نے گھوش کو جیل سے رہا کرایا اور اُسے ہر بات اچھی طرح سمجھا دی... پھر آفتاب اور آصف کو یہاں بھیج دیا... اس طرح ہمیں یہ بات فوراً معلوم ہو گئی کہ لفافہ کس گھر میں ہے... آفتاب اور آصف کے ساتھ ہی میں یہاں چلا آیا تھا... لیکن ان کی نظروں سے چھپ کر، یہاں جب سردار ہارون کا نام سامنے آیا... واضح رہے کہ یہ بات مجھے گھوش سے ہی معلوم ہو گئی تھی، تو میں نے سردار ہارون کے بارے میں معلوم کرایا... معلوم ہوا، آدمی لالچی ہیں... میں سمجھ گیا کہ وہ ضرور لالچ میں آ گئے ہوں گے اور انھوں نے ہمارے جاسوس کی لاش کو حکومت کے حوالے نہیں کیا ہو گا اور نہ تصویروں والے لفافے کے بارے میں کچھ بتایا ہو گا... اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ انھوں نے جاسوس کی لاش اپنے باغ میں دبا دی ہو گی... اب ان کا باغ کھدوایا جائے گا اور لاش برآمد کی جائے گی... گھوش کی سزا میں رعایت دے دی جائے گی، کیونکہ اس نے بھی اپنا پارٹ بخوبی نبھایا ہے... تصویروں والا لفافہ مل جانے کے بعد تو کسی شک کی گنجائش رہ ہی نہیں گئی تھی، لہٰذا یہ ہے کل کہانی... میں نے عابد رئیسانی کے شہر میں ایک آفیسر کو فون کر دیا تھا، وہ ڈپٹی کمشنر صاحب کو فون پر اطلاع دے گا اور وہ ہمیں اطلاع دے دیں گے... انوار صاحب، آپ کھدائی کرنے والوں کو بلا لیں، ہم آج ہی فارغ ہو کر یہاں سے روانہ ہو جانا چاہتے ہیں۔''

''لیکن ابا جان، ابھی تو آپ کو ڈپٹی کمشنر صاحب کے ہاں بھی جانا ہے۔''

''ہاں، ان سے بھی ملیں گے اور بس فوراً ہی اجازت لے لیں گے۔''

''لیکن کیوں انکل، آخر ایک آدھ دن قصبے کی سیر کرنے میں کیا حرج ہے، آپ کو معلوم ہی ہے، یہاں آتے ہی تو ہم اس کیس میں اُلجھ گئے تھے۔''

''میں نہیں چاہتا، اب تمہارے سکول کا اور حرج ہو۔'' انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

''ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے... خیر کوئی بات نہیں۔''

اسی وقت انوار صدیقی نے فون کا ریسیور اٹھایا اور کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگا... پھر فون سے فارغ ہو کر اس نے کہا:

''کھدائی کرنے والے مزدور تھوڑی دیر تک پہنچ جائیں گے جناب۔''

''ارے ہاں، ابھی تو ہمیں عابد رئیسانی کے چہرے سے نقاب بھی اٹھانا ہے۔'' آصف نے اٹھتے ہوئے کہا اور اس کے چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔

انھوں نے دیکھا، وہ عابد (باقی صفحہ 32 پر)

آمنے سامنے

☆ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ: شمارہ 591 ملا۔ بہت ہی زبردست تبصرے ہوئے ہیں۔ آپ نے دو باتیں میں نور الامین اور دیگر حضرات کی حوصلہ افزائی کی، بے شک وہ اس قابل تھے۔ دو باتیں میں آپ نے لکھا کہ سالنامہ کچھ لوگوں کو بالکل پھیکا لگا، مجھے ان لوگوں سے کیا، میں تو اپنا کام پوری دیانت داری سے کرتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ الفاظ مناسب نہیں تھے۔ مجھے احساس ہے کہ آپ بہت جانفشانی سے شمارہ تیار کرتے ہیں۔ چاہیے تو یہی کہ آپ کو آپ کے اخلاص کا پورا صلہ دیا جائے، لیکن دنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ بہرحال پھر بھی یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ مجھے ان سے کیا۔ ہاں اگر ایسا کہنے والے حاسدین ہوں تو ان سے یہ بات کہہ دیں تو بات سمجھ میں آتی ہے مگر بچوں کا اسلام کا تو یہ پلیٹ فارم ہی نہیں۔ بچوں کا اسلام کا کام تو بس محبت دینا ہے۔ (ف۔ح۔ کراچی)

ج: آپ کی بات بالکل بجا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں بچوں کا اسلام کے مخالفین کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔

☆ گیارہویں سالنامے کے تبصرے میں میں نے لکھا تھا کہ اس کے ظاہر میں خرم صاحب کی فنی مہارت اور باطن پر مدیر کی اور ان کے ادارتی معاونین کی محنت چھائی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اکثر تبصرہ نگاروں اور قارئین کی رائے یہی ہے کہ آپ کی کہانی سوچ کا سمندر سالنامے کی بہترین کہانی تھی۔ لہٰذا اتنا اچھا سالنامہ تیار کرنے میں بطور مدیر آپ کی محنت اور کہانی سوچ کا سمندر لکھنے پر اور میرا جی چاہتا ہے، آپ لوگوں کو کچھ ہدیہ دوں۔ ہدیے کی تقسیم بھی لکھ رہا ہوں۔ امید ہے، قبول کریں گے۔

(بچوں کا اسلام سے محبت کرنے والا ایک قدر دان)

ج: ہدیہ قبول کرنا چونکہ سنت ہے، اس لیے قبول ہے۔ ویسے اس کے بغیر ہی تبصرہ کر دیا کریں۔ وہ بھی ہمارے لیے ہدیے سے کم نہیں ہوگا۔

☆ شمارہ 589 ملا۔ اتوار کے روز پڑھ نہ سکا، کیونکہ بچوں کے امتحانات تھے۔ اگلے دن پڑھا۔ دو باتیں نے حیران کر کے رکھ دیا۔ ہا کر حضرات کے بھی کیا کہنے۔ واقعات صحابہ کے قدم بہ قدم حیران کر رہے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور ہمارے اسلاف کیسے تھے۔ خاص طور پر غیبت والے واقعات تو دل ہلا دینے والے ہیں۔ تصویر کی دھمکی عمدہ جا رہی ہے۔ تتلی کے بارے میں معلومات حیرت انگیز تھیں۔ ف ح کراچی لینڈ کروزر کے ساتھ تھے۔ بہت عبرت انگیز انجام ہوا۔ شازیہ نور کی رہائی بھی پُرمغز تھی۔ اچانک موت پڑھ کر افسوس ہوا۔ بینا رانی کا پرانا رجسٹر بھی اچھی تھی۔ فوزیہ خلیل کی کہانی عمدہ تھی۔ (محمد احسن زماں۔ وزیر آباد)

☆ شمارہ 589 پڑھ کر دل بہت خوش ہوا۔ دو باتیں پڑھ کر حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہونا پڑا۔ آپ کی اور مولانا محمد افضل صاحب کی سادگی اور اخلاص پر رشک آیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور مولانا محمد افضل صاحب کو دونوں جہان کی خوشیاں عطا فرمائیں اور دنیا اور آخرت کے غموں اور پریشانیوں سے نجات عطا فرمائے۔ آخر میں آپ سے درخواست ہے کہ مہربانی فرما کر نیوز چینل ہرگز ہرگز شائع نہ کیا کریں۔ نیوز چینل دیکھ کر محمد شاہد فاروق پر بہت غصہ آتا ہے۔ (فراز احمد بن سلطان محمود۔ کراچی)

ج: اور آپ کا خط پڑھ کر انھیں بھی تو غصہ آیا ہوگا۔

☆ شمارہ 589 ملا۔ ہمیں یہ بات کھائے جا رہی ہے کہ جب ف ح کراچی مرد ہیں تو اپنا نام چھپانے میں کیا حکمت ہے، لیکن ہم نے یہ کہہ کر اپنی پریشانی روک لی۔ ''سانوں کی'' شمارے میں تقریباً تمام کہانیاں معروف لکھنے والوں کی تھیں۔ واہ جی! کمال ہو گیا۔ کیا ہم ایک ہیں، شاید آپ نے غلطی سے شائع کر دی۔ ایک کہانی ارسال ہے، امید ہے ''600 میں'' جگہ دیں گے، ورنہ ردی کی بالٹی تو کہیں گئی نہیں۔ (محمد ذوالکفل حنفی)

ج: واقعی یہ بات تو آپ نے ٹھیک لکھی۔ وہ تو میرے پاس ہی ہے۔

☆ شمارہ 589 کی دو باتیں پڑھ کر حیرت کا جھٹکا لگا۔ کتنے اچنبھے کی بات ہے نا۔ ایڈیٹر کو اخبار نہ ملے۔ آفرین ہے مولانا افضل صاحب پر۔ کبھی اپنا آپ ایسا ظاہر نہیں کیا اور انھی کی طرح آپ بھی۔ ف ح کا قلمی نام اگر لکھا جائے تو زیادہ بھائے گا۔ شازیہ نور نے بھی شرکت کی اور خوشی ہوئی۔ عبدالحنان کا پتا چلا یا نہیں۔ (بنتِ مولانا سیف الرحمٰن۔ گوجرانوالہ)

ج: جی نہیں! کوئی پتا نہیں چلا۔

☆ شمارہ 592 میں نہار منہ پانی پینا کے نام سے مضمون شائع ہوا۔ اس میں حدیث کا صرف مفہوم لکھا گیا۔ حدیث کا پورا حوالہ نہیں دیا گیا۔ پورا حوالہ دوبارہ دیں، کیونکہ لوگوں میں یہ بات اس قدر مضبوط ہو چکی ہے کہ کوئی چھوڑنے کو تیار نہیں جب حدیث کا حوالہ دیں گے، تب مان جائیں گے۔ (عبداللہ قریشی۔ مانسہرہ)

ج: جی اچھا! حدیث کا حوالہ موصول ہونے پر شائع کر دیا جائے گا۔

☆ ایک عدد کہانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ میرے ایک عزیز کا واقعہ ہے۔ اگر آپ ایک سلسلہ شروع کریں نا قابلِ فراموش تو قارئین اپنی زندگی کے ایسے واقعات لکھ کر بھیجیں گے جو بھلائے نہ جا سکیں۔ اس طرح بچوں کا اسلام میں مزید دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے۔ سالنامے کی چند یادیں میں آپ نے سرور مجذوب کو جو نقاب سے ڈھانپنے کی کوشش کی تھی، قارئین نے اس نقاب پوشی کو پہچان لیا ہے۔ اب آپ کو قارئین کی سمجھ داری کی داد دینی پڑ گئی۔ (نورالامین۔ میاں چنوں)

ج: میں تو پہلے ہی قارئین کی سمجھ داری کی داد دیتا نہیں تھکتا، لیکن آپ کی بات میرے پلے نہیں پڑی۔ چند یادیں میں نے نہیں لکھی۔

☆ اشتیاق احمد انکل! مجھے کچھ رقم الرشید ٹرسٹ کو بھجوانی ہے، مگر مجھے ان کے ادارے کا پتا معلوم نہیں، نہ ان کا اکاؤنٹ نمبر معلوم ہے۔ آپ ان تک یہ رقم پہنچا دیں۔ میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے۔ آمین! اللہ حافظ! (نام نہ پتا)

ج: آپ نے ڈاک کے عام لفافے میں رقم ارسال کی۔ اس طرح رقم گم ہو سکتی ہے اور لفافے میں رقم بھیجنا ہے بھی خلافِ قانون، لہٰذا آئندہ ایسا نہ کریں۔ رقم منی آرڈر کرنی چاہیے۔ آپ کی رقم الرشید ٹرسٹ کو بھجوا رہا ہوں مطمئن رہیں۔ آئندہ کے لیے ان کا پتا نوٹ کر لیں۔ معمار ٹرسٹ۔ جامعۃ الرشید۔ احسن آباد سوپر ہائی وے کراچی۔

☆ بچوں کا اسلام سے ہمیں جنون کی حد تک محبت ہے۔ اس بات کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں کہ ہم ایک خط پوسٹ کرنے کے لیے چھ سات کلومیٹر سفر کرتے ہیں اور اس طرح آنے جانے میں بیس روپے لگتے ہیں۔ گویا ایک خط پر تیس روپے خرچ آتا ہے، لیکن ہم یہ سب گوارا کرنے کے لیے خوشی سے تیار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے پیارے رسالے کو چمکتا دمکتا رکھے۔ (محمد اسعد مدنی۔ جامعہ محسنین القرآن۔ نوشہرہ)

ج: خوشی ہوئی۔

☆ بچوں کا اسلام میں انٹرویو کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ اس طرح کبھی کسی رسالے میں انٹرویو نہیں لیے گئے۔ انوکھا طریقہ شروع کیا آپ نے۔ ایک سال پہلے بچوں کا اسلام میں اشاعت کے لیے ایک نظم ارسال کی تھی۔ ایک اور نظم ارسال ہے۔

(عبدالکریم احسن۔ ہارون آباد)

ج: نظم کسی شاعری کے استاد سے اصلاح کرا کے ارسال کریں۔ شکریہ!

☆ شمارہ 592 ہاتھوں میں ہے۔ حسبِ معمول قرآن، حدیث، کے بعد دو باتیں پڑھیں اور اندازہ ہوا کہ بے چارے مدیر کس قسم کی مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہم تو قارئین میں شمار ہیں، نہ کہ شمارہ تیار کرنے والوں میں۔ ہر ہفتے تیار شدہ شمارہ پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ تصویر کی دھمکی خوب جا رہا ہے۔ سارہ الیاس کی کہانی کاش کا لشکر بہت پسند آئی۔ ف ح کی کہانی فقیر کہانی بہت لرزہ خیز تھی۔ آمنے سامنے میں سالنامے پر تبصرہ والے خطوط میں سب سے زیادہ محمد شاہد فاروق پھلور کا خط پسند آیا۔

(حفصہ سیماب۔ کراچی)

ج: چلیں آپ نے یہ بات محسوس تو کی۔

☆ 589 ہاتھوں میں ہے۔ اثر جون پوری کی نظم میل کر دینا اچھی لگی۔ عبداللہ فارانی کے واقعات قدم بہ قدم کی قسط بہت اچھی لگی۔ ناول تصویر کی دھمکی بھی خوب ہے۔

ف ح کی لینڈ کروزر سارے گھر کو پسند آئی۔ (حافظ محمد معاویہ۔ لاہور)

ج: لینڈ کروزر جو ہوئی۔

☆ جونہی شمارہ 593 ملا، آپ کا ناول حسبِ دستور سب سے پہلے پڑھا۔ بہت سسپنس فل جا رہا ہے۔ اس کے بعد دو باتیں کی باری آئی۔ ان کا سوال بہت سبق آموز تھی۔ مولانا محمد ہاشم کا سفر نامہ مصریوں کی مستیاں بہت اچھی تحریر تھی۔ کراچی کی بس کے حالات پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ پنکی کے ابو پڑھ کر لگا، وہ ملاؤں کے کچھ زیادہ ہی دشمن ہیں۔ شاہد فاروق کا سفر بہت پسند آیا۔ (ربیعہ اصغر۔ نندوالی)

ج: آپ کا تبصرہ بھی پسند آیا۔

☆ 592 میں دو باتیں دلچسپ تھیں۔ آپ پر بہت ترس آیا کہ اتنی کڑوی باتیں سننے کے باوجود اپنا کام کیے جا رہے ہیں۔ محمد شاہد پھلور بہت اچھے انداز میں ڈاکٹر حضرات کی کھال اتارتے ہیں۔ واقعات صحابہ کے قدم بہ قدم بہت ہی پسندیدہ ہے۔ چولہا جلتا ہے بلال پاشا کی زبردست تھی۔ کاش کا لشکر، فقیر کہانی سب سبق آموز تھیں۔ آپ کے ناول کے تو کیا ہی کہنے۔ سالنامے پر محمد شاہد فاروق کا تبصرہ بہت پسند آیا۔

(محمد ابراہیم قاسمی۔ نیو سنٹرل جیل۔ ملتان)

ج: آپ کا شکریہ کہ ترس کھایا۔

☆ 597 کی دو باتیں میں آپ نے سوال پوچھا تھا، اس کا جواب یہ ہے کہ ہم الحدیث والقرآن پر تبصرہ نہیں کرتے یا اشتہارات کے بارے میں نہیں کرتے۔ درست جواب کون سا ہے؟ (حافظہ مریم فاطمہ۔ کورنگ ٹاؤن اسلام آباد)

ج: درست جواب دو باتیں میں لکھوں گا۔

☆ آپ کے ناول ذہنی تربیت کا کام کرتے ہیں، مہربانی کر کے ایک ناول خالص جہاد پر بھی لکھیں اور اسے بچوں کا اسلام میں قسط وار شائع کریں اور بچوں کا اسلام میں سنتوں کے متعلق بھی لکھیں۔ (طاہرہ آرا رحیم۔ رحیم یار خان)

ج: حیرت ہے، آپ کو بچوں کا اسلام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر مضامین نظر نہیں آتے۔

☆ محمد شاہد فاروق پھلور صاحب کا مزاحیہ مضمون پہلا قدم پڑھا۔ بقول پھلور صاحب! پروفیسر ہونے کی حماقت کر چکا ہوں اور تین ایم اے کر کے تین گنا پاگلوں میں شمار کیا جا سکتا ہوں، مہربانی کر کے میری ان باتوں کو ایک پاگل کی باتیں خیال کر کے نظر انداز کر دیجیے گا۔ میرے گھر میں بچوں کا اسلام اور خواتین کا اسلام آتے ہیں۔ میرے بچے، پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں شوق سے پڑھتے ہیں۔ دونوں رسالے میری نظر سے بھی گزرتے ہیں، اس حوالے سے چند باتیں پیشِ خدمت ہیں:

پہلی بات جو میں نے محسوس کی ہے، ان دونوں رسالوں کی فکر ایک دائرے میں محدود ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس حصار سے نکل کر علمی اور ذہنی وسعت کے ساتھ دین کی روشنی پھیلائی جائے، تاکہ پڑھنے والے کنویں کے مینڈک بن کر نہ رہ جائیں۔ دوسری چیز جو میں نے محسوس کی ہے، اکابر پرستی کی بو ہے جس طرح کچھ لوگ قبر پرست ہیں، اسی طرح آپ کے حصے میں اکابر پرستی جڑ پکڑے محسوس ہوئی ہے۔ آپ کے رسالوں میں خاص فکر کے علما کو اکابر کا نام دیا جاتا ہے۔ پھلور صاحب نے ایم اے کرنے والوں کو پاگل اور یونیورسٹیوں کو پاگل خانے قرار دیا ہے۔ یہ کہاں کی عقل مندی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا یہ خط شائع کریں، نہ ہی آپ کا رسالہ اس خط کا بوجھ اٹھا سکتا ہے۔ مجھے جواب دینا چاہیں تو میرا پتا حاضر ہے۔ (بشیر احمد ساہی۔ سرگودھا)

ج: آپ کا خط کافی طویل ہے۔ نصف سے بھی کم حصہ شاملِ اشاعت کیا جا سکا (معذرت) بچوں کا اسلام میں ہر قاری اپنی رائے آزادانہ دے سکتا ہے۔ پھلور صاحب خود بھی ڈبل ایم اے ہیں۔ ہمارے پروفیسر محمد اسلم بیگ صاحب بھی پروفیسر ہیں اور بھی بے شمار پروفیسر صاحبان بچوں کا اسلام پڑھتے ہیں، لیکن آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا، اُن پروفیسر صاحبان کی طرف سے کبھی ایسا ردِعمل موصول نہیں ہوا، تاہم آپ کے اس خط کی روشنی میں، اپنی خامیاں ضرور دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ فی الحال آپ کا خط پھلور صاحب کو اور پروفیسر محمد اسلم بیگ صاحب وغیرہ کو ارسال کر رہا ہوں، تاکہ یہ حضرات آپ کے خط پر غیر جانب داری سے تبصرہ کر سکیں۔ اس طرح ہم لوگ اپنی خامیوں کی طرف مزید توجہ دے سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی کوششوں میں عاجزی عطا فرمائے۔

☆ یہ میرا بچوں کا اسلام میں چوتھا خط ہے، لیکن ابھی تک ایک ہی شائع ہوا ہے۔ میں پہلے بچوں کا اسلام میں دو باتیں، آمنے سامنے اور نیوز چینل نہیں پڑھتی تھی، لیکن ایک روز فارغ بیٹھی تھی۔ سوچا، دو باتیں یا نیوز چینل پڑھ لوں کہ شاید مزے کا ہو، تب سے پڑھنا شروع کیا اور جب میرا پہلا خط شائع ہوا تو اس وقت سے آمنے سامنے پڑھنا شروع کر دیا اور اب تو جس شمارے میں نیوز چینل نہ ہو تو شمارہ پھیکا پھیکا لگتا ہے۔

(حافظہ مریم فاطمہ۔ اسلام آباد)

ج: واقعی جب تک کوئی چیز پڑھی نہ جائے، کیسے اس کے بارے میں رائے قائم کی جا سکتی ہے؟

☆ جب میں جامعہ عمر بن خطاب میں پڑھا کرتا تھا تو ہمارے استادِ محترم قاری محمد یوسف صاحب (اللہ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے) ہمیں اس رسالے کو پڑھنے کے لیے کہا کرتے تھے، ویسے انکل! میں اردو پڑھنا پسند کرتا ہوں۔ جب نیا شمارہ ختم ہو جاتا ہے تو کوئی پرانا رسالہ پڑھنے لگتا ہوں۔ (حافظ محمد احمد۔ تھرمل کالونی۔ مظفر گڑھ)

ج: آپ کے استادِ محترم کی بات خوب تھی۔ الحمدللہ!

☆ اللہ کے فضل و کرم سے بچوں کا اسلام مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ یہ اس میں کام کرنے والوں کے اخلاص کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے مزید چکائے۔ محمد شاہد فاروق کا نیوز چینل بہت اچھا لگتا ہے۔ سید بلال پاشا واہ کینٹ بھی اچھا اضافہ ہیں۔ حافظ عبدالجبار اور حافظ عبدالرزاق بھی خوب لکھتے ہیں۔ کراچی کی بس بہت مزاحیہ تھی۔

(محمد عثمان حبیب۔ کہروڑ پکا)

ج: شکریہ!

☆ شمارہ 591 میں احمد عدنان طارق کی بوتل کا جن پسند آئی۔ محمد شاہد فاروق کی مفت میں اور اعظم طارق کی جاسوسی کہانی پھول بھی پسند آئی۔ اس شمارے میں تمام تحریریں پسند آئیں۔ شمارہ 592 میں سارہ الیاس کی کہانی کاش کا لشکر اچھی لگی۔ آصف مجید کی نہار منہ پانی پینا معلومات افزا تھی۔ میں بھی اب تک نہار منہ پانی پیتی رہی ہوں۔ اچھا ہوا، یہ بات معلوم ہو گئی۔ (عشرت جہاں۔ ٹاؤن شپ لاہور)

☆ شمارہ 593 میرے سامنے ہے۔ دو باتیں ہر بار کی طرح گھماؤ پھراؤ لیے ہوئے تھیں۔ دو باتیں میں آپ نے ایک سوال کیا ہے، ہم نے خوب عقل کے گھوڑے دوڑائے تو ہمارے ذہن نے جواب دیا کہ وہ چیز قرآن و حدیث ہے۔ اس سلسلے پر کبھی کسی نے تبصرہ نہیں کیا۔ (زہرہ امین۔ راولپنڈی)

ج: کیا کیا جائے! دو باتیں میں گھماؤ پھراؤ آ ہی جاتا ہے۔ سوال کا جواب دو باتیں ہی میں دوں گا۔

☆ شمارہ 593 میں دو باتیں پڑھیں۔ بالکل بھی بے ڈھب، بے ڈھنگی اور اوٹ پٹانگ نہیں تھیں۔ مجھے تو آپ کی دو باتیں اس قدر اچھی لگتی ہیں جیسا کہ گل دوپہری کے پھول کو سورج کی روشنی اچھی لگتی ہے۔ آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ بچوں کا اسلام کی قیمت پر تبصرہ نہیں کیا جاتا۔ (سلمیٰ مراد۔ ڈیرہ غازی خان)

ج: سوال کا جواب دو باتیں میں پڑھ لیجیے گا۔

☆ میں اپنے استاد مولانا محمد امین دوست کی لکھی ہوئی ایک کتاب آپ کو ہدیہ کر رہا ہوں۔ ملنے پر جوابی خط کے ذریعے اطلاع ضرور دیجیے گا۔ شکریہ۔ (مصباح اللہ۔؟)

ج: آپ کی ارسال کردہ کتاب مل گئی ہے۔ سرسری نظر ڈالی ہے۔ بہت مفید کتاب ہے۔ اللہ جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ نے اپنا پتا نہیں لکھا، لہٰذا آمنے سامنے میں جواب دے رہا ہوں۔ شکریہ!

☆ شمارہ 593 ہمیشہ کی طرح بہترین تھا۔ محمد عثمان سے ان کی بلی کی تعزیت کرتے ہوئے کہتی ہوں، اللہ اسے بخشے۔ نواب صاحب نے بہت سخاوت کا مظاہرہ کیا۔ بہت متاثر ہوئی۔ کراچی کی بس بہت مزاحیہ تھی۔ دو باتیں میں آپ نے جو سوال پوچھا ہے۔ اس کا جواب ہے القرآن، الحدیث۔ (امامہ خان عثمانی۔ فیصل آباد)

ج: محمد عثمان کی طرف سے شکریہ!

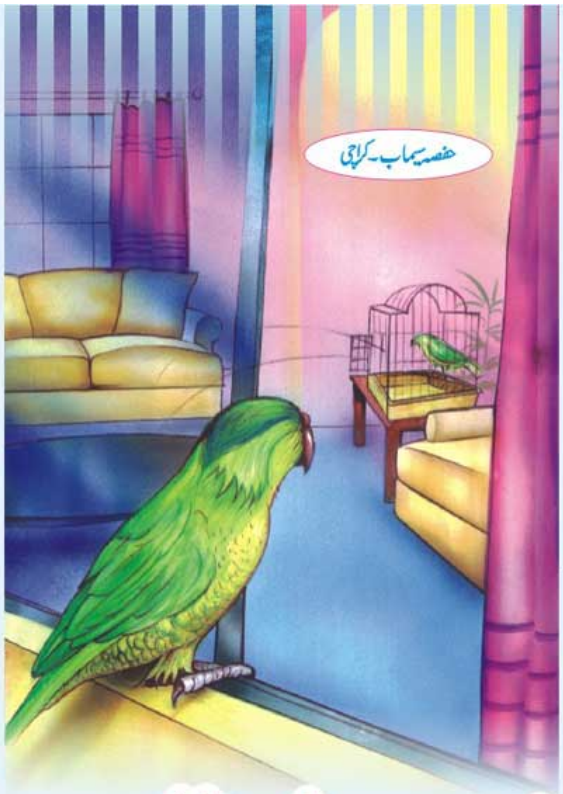

آزادی کی قیمت

حفصہ سیماب۔ کراچی

"بیٹا اس طوطی کا خیال رکھنا۔ ہر وقت نکل بھاگنے کی فکر میں ہوتی ہے۔" ابو جان آفس جانے کے لیے تیار تھے، پاس سے گزرتے ہوئے کہنے لگے۔ ابو جان کی بات سن کے ہم بھی خاصے پریشان ہوگئے۔ آثار تو واقعی کچھ ایسے ہی لگ رہے ہیں۔ ہم نے سر ہلاتے ہوئے ابو جان کو جواب دیا۔ اصل میں ہم سبھی بہن بھائی پرندے پالنے کے بہت شوقین ہیں۔ طلحہ تو گویا دیوانہ ہے۔ کسی کے گھر آسٹریلین طوطے نظر آجائیں تو گھنٹوں بیٹھ کے ان کو دیکھتا رہتا ہے۔ اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے ابو جان نے آسٹریلین طوطوں کی ایک جوڑی لا دی۔ دونوں طوطے بہت خوب صورت تھے۔ طوطا ہلکا طوطیا جب کہ طوطی گہرے طوطیا رنگ کی تھی۔ جب دونوں ایک ساتھ بیٹھے ہوتے تو یوں لگتا کہ ہلکے اور گہرے رنگ کا پینٹ کر دیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد طوطی نے انڈے دینے شروع کر دیے۔

طلحہ تو اسکول سے آتے ہی سیدھا طوطوں کے سلام کو جاتا۔

ایک دن میں مدرسے سے واپس آئی۔ ابھی برقع اتار رہی تھی کہ طلحہ بھاگتا ہوا آیا اور گھبرائے ہوئے انداز میں بتایا کہ طوطوں کے پنجرے کا دروازہ اس کے اندر گر گیا ہے۔ میں فوراً پنجرے کے پاس آئی۔ دیکھا تو واقعی دروازہ اس کے اندر گرا تھا۔ جلدی سے اس کو نکالا۔ چار میں سے تین انڈے ٹوٹ چکے تھے۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ پھر اچانک یاد آیا کہ یہ دروازہ صبح تو اس کے اوپر نہیں تھا۔ پھر کیسے اندر گر گیا؟ میں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ طلحہ کا کارنامہ ہے۔ غصہ تو بہت آیا مگر سوچا اب ڈانٹ کا کوئی فائدہ بھی نہیں، جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ طوطی بے چاری نے پہلے تو خوب شور مچایا مگر پھر صبر شکر کر کے اسی انڈے کی خدمت میں مصروف ہوگئی۔ کچھ دنوں بعد جب انڈے سے بچہ نکلا تو سب بہت خوش ہوئے۔ جب بھی پنجرے پہ نظر جاتی تو دونوں ماں باپ باری باری باجرہ کھلاتے ہوئے ہی نظر آتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بچہ پھول کے کپا ہوگیا۔ اب اس کے جسم پہ بال بھی آگئے تھے۔ بچہ جیسے جیسے بڑا ہوتا جا رہا تھا، ساتھ ساتھ شریر بھی ہوتا جا رہا تھا۔ جو کوئی بھی دیکھتا، حیران رہ جاتا کہ اتنی خوب صورت طوطی پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ ماں باپ سے بالکل مختلف۔ ہلکا آسمانی رنگ تھا جب کہ سر کے بال درمیان سے سیاہ تھے۔ سب گھر والے بھی طوطی سے بہت پیار کرنے لگے تھے۔ اس کی شرارتیں دن بدن بڑھتی جا رہی تھیں۔ ہر وقت اچھل کود مچائے رکھتی۔ جس سے اس کے آرام اور ماں باپ کی نیند میں خلل واقع ہوتا تو دونوں غصہ سے اسے گھورنے لگتے۔ نچلا بیٹھنا تو گویا جانتی ہی نہیں تھی۔ ہر وقت پنجرے سے باہر جانے کی فکر میں رہتی۔ اگر اس کے ماں باپ میں سے کوئی سونے کی کوشش کرتا تو طوطی فوراً اس کے پاس پہنچ جاتی اور شور مچانا شروع کر دیتی۔ جیسے کہہ رہی ہو:

"اٹھو سونے والو کہ میں آگئی ہوں۔" اس حرکت پہ اکثر اسے ماما طوطی سے جھڑکی بھی سننی پڑ جاتی اور کبھی تو اس کی ماں "ہُپ" سے تھپڑ مارنے کی کوشش بھی کرتیں مگر طوطی پھُر سے اڑ کے دوسرے کونے میں پہنچ جاتی۔ ابو جان نے ایک دوسرے پنجرے کا انتظام بمع ایک عدد طوطے کے کیا اور ننھی طوطی کو اس میں ڈال دیا۔ یہاں آکر بھی وہ طوطی ہر وقت اچھل کود مچائے رکھتی۔ جب بھی دیکھو پنجرے سے باہر نکلنے کے لیے کوشاں رہتی۔ ابو جان اس کی اس کوشش کو دیکھتے ہوئے اکثر کہتے تھے کہ یہ طوطی کسی نہ کسی دن ضرور آزاد ہو جائے گی۔ اس کا خاص دھیان رکھنا۔ ابو جان کی اس بات کو مدنظر رکھ کر اس کا پنجرہ ایسی جگہ سیٹ کر دیا جہاں ہر وقت کسی نہ کسی کی نگاہوں میں رہے۔ مگر وہی ہوا جس بات کا ڈر تھا، ننھی طوطی کی کوششیں رنگ لے آئیں اور ایک دن وہ پنجرے سے نکل بھاگی۔ شام کا وقت تھا اور ہم سب سامنے ہی تھے مگر افسوس اسے پنجرے سے نکلتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔ اچانک ہی میں نے دیکھا، وہ پنجرے میں نہیں تھی اور طوطا ایک کونے میں دبکا ہوا تھا اور طوطی سامنے دیوار پہ بیٹھی تھی۔ میری تو حیرت کے مارے چیخ نکل گئی۔ میں، طلحہ اور عبدالرؤف طوطی کی طرف بھاگے مگر وہ ہماری پہنچ سے دور برابر والوں کی چھت پہ جا بیٹھی اور ہم نیچے ہاتھ ملتے رہ گئے۔ طوطی جیسے ہی چھت پہ بیٹھی بیسیوں کوے اس کے اوپر منڈلانے لگے۔ طوطی نے کوؤں سے گھبرا کے جیسے ہی اڑان بھری تو تاک میں بیٹھا ہوا ایک کوا اسے اچک کے لے گیا۔ باقی کوے بھی اس کے پیچھے لپکے۔ طلحہ نے تو باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔ ابو جان نے اسے تسلی دی، پھر کہا: بیٹا یہ طوطی بہت باہمت تھی۔ کتنے عرصے سے مسلسل آزادی کی کوشش میں مصروف تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ یہ آزادی کی زندگی اس کے لیے کس قدر نقصان دہ ثابت ہوگی۔

ہماری طوطی تو چلی گئی مگر ہمیں بہت بڑا سبق دے گئی۔ میں سوچنے لگی کہ ہمارے بزرگوں نے مسلسل کوششوں، محنت اور اپنے پیاروں کی جانوں کا نذرانہ دے کر ہمارے لیے آزادی تو حاصل کر لی مگر افسوس کہ ہم اپنی نادانی کے سبب پھر سے دشمنوں کی اسیری میں چلے جانے کے لیے بے تاب ہیں۔ کیا ہمارا انجام بھی اس طوطی کی طرح نہیں ہوگا؟ ایک ہندو کی غلامی سے آزاد ہو کے ہم کس کس دشمن کا نوالہ بننے کے لیے تیار ہیں؟ ہم نے بھی طوطی کی طرح آزادی تو حاصل کر لی مگر کیا ہم اپنی آزادی بچا پائے ہیں؟

معصوم اُمنگیں

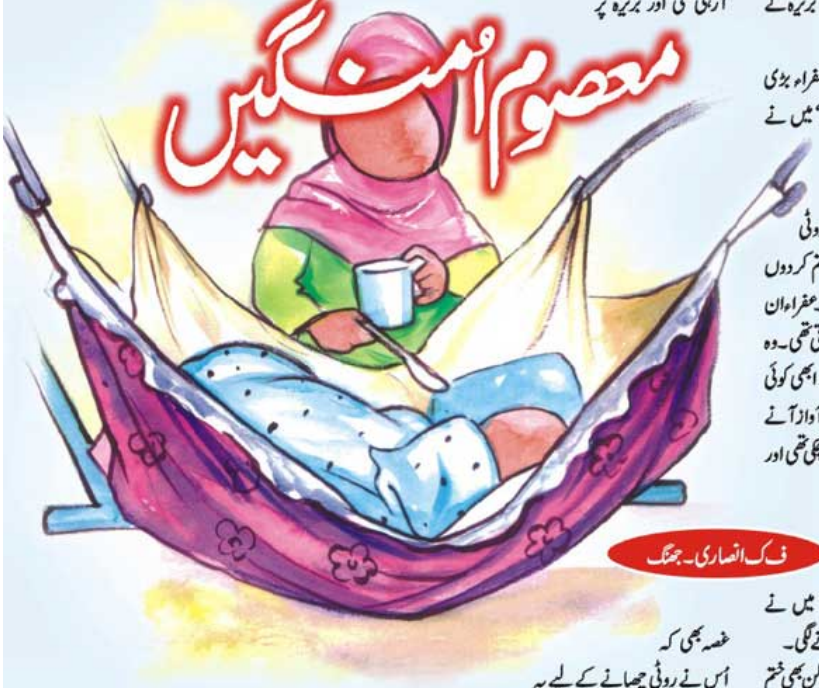

ف ک انصاری۔ جھنگ

میں کچن میں مصروف تھی کہ اچانک عجیب سا احساس ہوا۔ میں سارے کام چھوڑ کر کمرے میں آئی تو ایک عجیب منظر میرا منتظر تھا۔

چار سالہ بریرہ نے ایک ہاتھ میں چائے کا کپ جب کہ دوسرے ہاتھ میں چمچ پکڑا ہوا تھا۔ جس میں چائے تھی اور وہ اپنی دو ماہ کی بہن عفراء کو پلانے کے لیے چمچ اس کے ہونٹوں کے قریب لے جا چکی تھی۔

''بریرہ! یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟'' میں نے پکارا۔

''امی! عفراء کو چائے پلا رہی ہوں۔'' اُس نے بڑے شوق سے بتایا، گویا بڑا ہی اچھا کام کر رہی ہو۔

''اتنی منی سی بچی چائے نہیں پیتی بیٹا۔'' میں نے کپ اور چمچ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

''امی چاچی بھی تو پلاتی ہیں عکاشہ کو۔'' بریرہ نے منہ بسور کر کہا۔

''بیٹا! عکاشہ بڑا ہو گیا ہے۔ جب عفراء بڑی ہو جائے گی، تب عفراء کو بھی پلائیں گے۔'' میں نے نرمی سے سمجھایا تو وہ چپ ہو گئی۔

ایسے ہی ایک روز بریرہ کھانا کھا رہی تھی۔ میں نے کہا، آپ نے یہ ساری روٹی کھانی ہے تو بریرہ نے کہا، جی میں ساری ختم کر دوں گی۔ میں گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ عفراء ان دنوں چیزوں کو پکڑ پکڑ کر چلنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ وہ بھی بریرہ کے ساتھ اسی کمرے میں تھی۔ ابھی کوئی آدھا گھنٹا گزرا ہو گا کہ عفراء کے رونے کی آواز آنے لگی۔ میں کمرے میں آئی تو بریرہ کھانا کھا چکی تھی اور عفراء مسلسل رو رہی تھی۔

''بریرہ! آپ نے مارا ہے عفراء کو؟''

''نہیں تو۔'' برجستہ جواب آیا۔

''پوری روٹی کھا لی نا آپ نے؟'' میں نے پوچھا اور عفراء کو چپ کروانے کی کوشش کرنے لگی۔

''جی امی! یہ دیکھیں میں نے سارا سالن بھی ختم کر دیا۔'' بریرہ نے اپنی پلیٹ مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔

''شاباش! میں نے کہا اور عفراء کو چپ کروانے کی کوشش میں لگ گئی۔ سردیوں کے دن تھے۔ میں سمجھی شاید اسے سردی لگ رہی ہے۔ میں ہیٹر کے پاس لے آئی مگر وہ پھر بھی روتی رہی۔ پھر مجھے خیال آیا، اس کے پیٹ میں گڑبڑ نہ ہو، لہٰذا پیٹ کی گڑبڑ دور کرنے کے لیے مختلف دوائی اور ٹوٹکے بھی کر لیے مگر عفراء چپ نہ ہوئی۔ مشکل یہ تھی کہ وہ جھولے میں لیٹنے کو بھی تیار نہیں تھی۔ میں پریشان اللہ اسے کیا ہو گیا۔ آدھا پونا گھنٹا گزر گیا۔ آخر میں نے سوچا، اسے سلانے کی کوشش کرتی ہوں، کیا خبر نیند کی وجہ سے رو رہی ہو۔ میں نے اسے کندھے سے لگا کر کمر پر تھپکیاں دینا شروع کیں تو مجھے ایک اور عجیب چیز محسوس ہوئی۔

عفراء کی کمر پر کوئی سخت سی چیز تھی، چونکہ عفراء نے گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔ جو جسم کے ساتھ لگا رہتا ہے، لہٰذا وہ چیز بھی جسم کے ساتھ ہی چپکی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی قمیص میں ہاتھ ڈالا اور وہ چیز پکڑ کر باہر نکال لی۔ اب تو میری حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔

وہ چیز روٹی کا وہ چوتھائی حصہ تھا جو بریرہ کو کھانے کے لیے دیا ہوا تھا۔ سردی کی وجہ سے وہ نکڑا کر سوکھ کر سخت ہو گیا تھا اور عفراء کی نرم و نازک کمر پر بری طرح چبھ رہا تھا جس کی وجہ سے یہ روتی جا رہی تھی۔

اب روٹی کے ٹکڑے کو دیکھ کر مجھے بے تحاشہ ہنسی آ رہی تھی اور بریرہ پر غصہ بھی کہ اُس نے روٹی چھپانے کے لیے یہ کون سی جگہ ڈھونڈی اور پھر مجھ سے جھوٹ بھی بول دیا کہ ساری روٹی ختم کر دی ہے۔

خیر میں نے اسے سمجھایا تو وہ معصوم سی صورت بنا کر سنتی رہی اور وعدہ کیا کہ آئندہ جھوٹ نہیں بولوں گی۔

آج بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو بہت ہنسی آتی ہے۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی یادداشت کی سلیٹ پر ابھر آیا۔

بریرہ کافی دن سے ہمارے پیچھے لگی ہوئی تھی کہ میری نئی جوتی لا کر دیں۔ ابو بریرہ نے کہا بھی کہ آپ کی یہ جوتی بالکل نئی ہے، ابھی تو لی تھی، جب یہ ٹوٹے گی تب نئی لا کر دیں گے مگر بریرہ کا کہنا تھا کہ مجھے یہ اب اچھی نہیں لگتی، حالانکہ خود پسند کر کے لائی تھی۔ خیر بات آئی گئی ہو گئی۔ ایک دن بریرہ صحن میں کھیل رہی تھی۔ میں اپنے کام کاج میں مصروف تھی۔ میں نے دیکھا، وہ صحن میں ننگے پاؤں کھیل رہی ہے۔ میں نے کہا بھی کہ جوتے پہنو مگر اُس نے دھیان نہ دیا۔ میں نے سوچا کہ اسے اپنے جوتے پسند نہیں، شاید اسی لیے نہیں پہن رہی۔

خیر رات کو میں نے گھر کی ساری کچرے والی ٹوکریاں صحن میں رکھیں اور انھیں کہا کہ یہ کچرا پھینک آئیں۔ یہ ساری اُٹھا کر لے گئے اور تھوڑی دیر بعد ہی خالی کر کے آ گئے۔

پھر ہم لوگ کھانا وغیرہ کھا کر چہل قدمی کی سنت پوری کرنے صحن میں آ گئے۔

بریرہ ننگے پاؤں تھی تو ابو بریرہ نے ڈانٹ کر کہا کہ جوتا پہن کر آؤ۔ یہ اندر اپنے جوتے ڈھونڈنے لگی۔ کافی دیر بعد آئی اور بتایا کہ جوتے نہیں مل رہے۔ ہم دونوں بھی اندر آ گئے اور ہر جگہ تلاش کیے، جہاں جہاں ہمیں اُمید تھی وہاں وہاں دیکھا۔

''یہ اپنی دادی کے گھر تو نہیں چھوڑ آئی جوتے؟'' میں نے ابو بریرہ سے پوچھا۔

''نہیں میں جب اسے لے کر آیا تھا تو جوتا پہنا ہوا تھا اس نے۔'' انھوں نے کہا اور پھر بریرہ سے پوچھا:

''بریرہ! آپ نے جوتا کہاں اُتارا تھا؟''

''یہیں کرسی کے پاس اتارا تھا یا شاید پلنگ کے نیچے رکھ دیا ہو گا۔'' بریرہ نے کہا تو ہم نے وہاں بھی دیکھ لیا

مگر جوتا تھا کہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب۔

پھر اچانک ہی مجھے ایک خیال آیا۔ جب یہ بہت چھوٹی تھی اور واکر میں چلتی تھی تو اسی طرح اس نے اپنی ایک دوائی گم کر دی تھی۔ ہم نے اُس دن بھی ہر جگہ ڈھونڈی تھی۔ آخر کچرے کی ٹوکری سے ملی تھی۔ میں نے فوراً ہی اپنا خیال ابوبریرہ کو بتایا۔ یہ اُسی وقت باہر نکل گئے اور پانچ منٹ بعد جب واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں بریرہ کے جوتے تھے۔

بریرہ کی شرارتیں تو اب بہت کم ہوگئیں مگر اب عفراء اپنی انوکھی شرارتوں سے ہمیں محظوظ کرتی ہے۔

ہم کھانا کھانے بیٹھیں یا پانی پینے لگیں عفراء (ڈھائی سالہ) کی نصیحتیں شروع پانی کا گلاس ہمارے ہونٹوں سے لگتے ہی عفراء کی آواز آتی ہے۔

"بِلّ اللہ پڑّیے" (بسم اللہ پڑھ کے) پھر ہمیں باآوازِ بلند بسم اللہ پڑھنا پڑتی ہے۔ پانی پی کر گلاس رکھا۔ عفراء کی آواز آئی۔

"اَلْحللہ پَلْ لیں" (الحمدللہ پڑھ لیں)

ہم کسی وقت کہیں گے کہ "عفراء آجاؤ چلیں" عفراء فوراً اصلاح کروائے گی۔

"آجاؤ نہیں آجائیں۔" ہم اسے اپنی یعنی بڑوں کی عزت کروانا سکھاتے ہیں۔ یہ ہمیں "اپنی" ہی عزت کروانا سکھاتی رہتی ہے۔

میں ابوبریرہ سے کوئی بات کہہ رہی تھی۔ وہ واش بیسن پر ہاتھ دھو رہے تھے، میں نے کہا:

"آپ پھر مجھے کل ڈاکٹر کے پاس لے جایئے گا۔"

"کیا؟" ابوبریرہ کو پانی کے شور میں سنائی نہ دیا۔ وہ ہاتھ دھو کر باہر آئے اور بولے:

"ہاں کیا کہہ رہی تھی تم؟"

عفراء جو اس وقت پلنگ پر لیٹی فیڈر پینے میں مصروف تھی، فوراً فیڈر منہ سے نکالا اور بولی:

"ہاں نی جی۔"

ابوب بریرہ نے ہنستے ہوئے نہایت فرمانبرداری سے کہا:

"جی! جی بیٹا جی! آپ دودھ پی لو۔"

"پی لو نہیں پی لیں۔" وہ بھی فوراً بولی۔

اور ہم بے اختیار ہنس پڑے:

ہمیں دن میں بے شمار دفعہ عفراء کی یہ نصیحتیں سننا پڑتی ہیں، لہٰذا اب ہم سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں کہ ہم اس کی عزت کریں گے، تب ہی یہ ہماری عزت کرنا سیکھے گی، ورنہ ساری زندگی ہم اسے سکھاتے رہیں گے اور یہ ہمیں۔

ہم والدین خود باعمل ہوں گے تو ہمارے بچے بھی خود بخود باعمل بنیں گے۔

بس شرط یہی ہے کہ ہمارا اپنا عمل سو فیصد ہو۔

بقیہ : تصویر کی دھمکی

ریسانی ہی تھا.. اب انسپکٹر کامران مرزا اس کی طرف بڑھے اور بولے: "اس کا اصل چہرہ بھی دیکھ لینا چاہیے۔"

انھوں نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا..

آفتاب اور آصف بھی نزدیک چلے آئے... اچانک آصف نے چونک کر کہا:

"انکل، جب یہ شخص ہمیں شابو کے بھیس میں ملا تھا تو اس کی آنکھیں نارنجی تھیں۔"

"ہاں، اس وقت اس نے آنکھوں میں کوئی دوا ڈال لی ہوگی... جس سے تھوڑی دیر کے لیے آنکھوں کا رنگ بدل جاتا ہوگا۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی ان کے ہاتھ نقلی عابد ریسانی کے چہرے پر اٹک گئے، انھوں نے پلاسٹک کے ٹکڑے اُتار پھینکے... انھوں نے دیکھا، ان کے سامنے ایک غیر ملکی پڑا گہرے سانس لے رہا تھا.. وہ اگرچہ ہوش میں تھا، لیکن یوں لگتا تھا، جیسے جان بوجھ کر بے ہوش نظر آنے کی کوشش کر رہا ہو..

آدھ گھنٹے بعد کھدائی والے آگئے اور انھوں نے باغ کی کھدائی شروع کر دی.. وہ ڈرائنگ روم میں کوئی خبر سننے کے انتظار میں بیٹھے رہے...

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف ڈپٹی کمشنر صاحب تھے، وہ کہہ رہے تھے:

"عابد ریسانی کا سراغ کئی گھنٹے کی کوشش کے بعد لگا ہے۔ وہ نشے میں دھت ایک گمنام جگہ پڑا تھا اور ہوش سے بے گانہ تھا... اُسے ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا... معلوم ہوا ہے وہ کئی روز سے نشہ آور دوا استعمال کر رہا ہے... یہ دوا اس کے پاس کہاں سے آئی؟ کسی کو معلوم نہیں... اس کے گھر والے بھی اُسے تلاش کر کے تھک چکے تھے اور تھانے میں رپورٹ بھی درج کرا چکے تھے۔"

"خیر، خدا کا شکر ہے، یہ مسئلہ بھی حل ہوا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ادھر کی کیا رپورٹ ہے؟"

"مجرم کو گرفتار کیا جا چکا ہے... تصویروں والا لفافہ بھی مل گیا ہے... اب ڈیسائی کی لاش کے لیے باغ کھدوایا جا رہا ہے۔"

"توبہ توبہ، لالچ بھی آدمی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے... سردار ہارون اگر اس ڈیسائی کی لاش اور لفافے کو حکومت کے حوالے کر دیتا تو آج اسے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا... سوچا تو اس نے یہ تھا کہ لفافہ دشمنوں کے حوالے کر دے گا اور لاکھوں روپے وصول کرے گا، گویا ملک کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں تھی... کیسے کیسے لوگ اس دنیا میں ہیں اور یہ لالچ بھی اس حالت میں کہ سردار ہارون کو کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔" ڈپٹی کمشنر نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"جی ہاں، بس اسی کا نام دنیا ہے... خدا محفوظ رکھے ایسے لوگوں سے۔"

"تو پھر تم آرہے ہو نا؟"

"جی ہاں، لاش ملنے کا انتظار ہے۔" وہ بولے اور ڈپٹی کمشنر نے فون بند کر دیا۔

ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک مزدور نے آکر بتایا:

"لاش مل گئی ہے وہ سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور باغ میں پہنچے... ایک درخت کے قریب گڑھے میں لاش پڑی تھی... ہڈیوں سے گوشت جھڑ چکا تھا.. چہرے کے نقوش کسی قدر باقی تھے.. اور اب تک یہ کہہ رہے تھے، ہم وہ نہیں جو وطن کو بیچ کھاتے ہیں... ہم تو وہ ہیں جو وطن کے لیے اپنی جان دے دیتے ہیں...

مسائل کی باتیں

س: اگر کوئی شخص صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان لا کر توحید کا قائل ہو جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانے تو وہ مسلمان سمجھا جائے گا یا نہیں۔

ج: جب تک حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے اور آپ کی تمام باتوں کی تصدیق نہ کرے اور آپ کی محبت دل میں نہ آجائے، ہرگز مسلمان نہیں ہوسکتا۔

حافظ آصف محمود قاسمی۔ لاہور

اس بارے میں حدیث:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ چار چیزوں پر ایمان نہ لائے (دل اور زبان سے) اقرار کرے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کا رسول ہوں۔ مجھے برحق نبی بنا کر بھیجا گیا ہے اور موت (یعنی دنیا کے فنا ہونے) پر اور موت کے بعد اٹھنے پر ایمان لائے اور تقدیر پر ایمان لائے۔ (ترمذی۔ ابنِ ماجہ)

حالتِ زار

عبدالعزیز۔ اسلام آباد

اردو ہماری قومی زبان ہے لیکن بڑی مسکین زبان ہے۔ عوام نے جس طرح سے اس کا حلیہ بگاڑا ہے، لگتا نہیں یہ ہماری قومی زبان ہے۔ اکثر لوگ تو اس سے بالکل ہی نابلد ہیں۔

ایک دن ہمارے بہنوئی صاحب فرمانے لگے:

''ہم دھیج وغیرہ بالکل نہیں لیں گے۔ سنا ہے بہت غلط رسم ہے۔''

''ہیں؟ یہ دھیج کیا بلا ہے؟'' کافی تگ ودو کے بعد پتا چلا کہ محترم جہیز کو دھیج کہہ رہے تھے۔

ہماری امی بتاتی ہیں کہ جب ہم چھوٹے تھے تو ''عید میلاد النبی'' کو یوں پڑھتے تھے۔ ''عید میلا دال نبی'' لیکن یہ انکشاف بعد میں ہوا کہ اسلام میں اب تیسری عید متعارف ہو چکی ہے۔ نعوذ باللہ ایک دن مطالعہ پاکستان کے استاد نے ایک بچے سے پوچھا:

بیٹا ترکی کا دارالحکومت کیا ہے؟

فوراً بولا: ''رَبَٹ۔''

استاد نے حیران ہو کر پوچھا: ''ربٹ کیا؟''

''سر! آر اے بی اے ٹی! ربٹ نہیں ہوتا؟''

سبحان اللہ رباط کو ربٹ بنا دیا۔

پچھلے دنوں ایک اور لطیفہ رونما ہوا۔ سوال تھا: درج ذیل الفاظ کے جملے بنائیں۔ ہماری جماعت میں ایک پٹھان صاحب بھی تشریف رکھتے ہیں۔ کہنے لگے، میڈم ویسے اردو کا کیا مطلب ہے؟ میڈم نے بتایا: لشکر! اب انھوں نے جو جملہ بنایا، وہ بھی قابلِ تعریف ہے۔ جملہ یہ تھا:

''ہم نے ایک اردو تیار کیا اور لڑنے چلے گئے۔''

ایک صاحب نے ایک اشتہار میں لکھا پتا پڑھا۔ بمقام: جامع مسجد ہذا، بولیں۔ ہیں! اس مسجد کا نام بدل کر ''ہذا'' رکھ دیا گیا ہے۔

اب تو بعض مغرب زدہ خواتین جو چلڈرن کو چلڈرنز بنا دیتی ہیں، اردو میں بھی دخل اندازی کرنے لگی ہیں۔ حال ہی میں اس کی مثال ملی۔ ایک فنکشن میں اسٹیج سیکرٹری صاحبہ نے یوں اعلان کیا:

''مرد حضرات ادھر آجائیں اور ''خواتینز'' (خواتین+S) اس طرف آجائیں۔''

ایک صاحب کہنے لگے:

''کثیر ابنِ تفسیر'' تو بہت میرے زیرِ مطالعہ رہی ہے۔''

بہت بڑے بڑے ادباء اور خطاط حضرات کو ''السلام علیکم'' کو اسلام علیکم یا السلام وعلیکم لکھتے دیکھا گیا ہے۔

اسی طرح اردو کی ایک اور میڈم کا حال یہ تھا:

''بچو! آج سے میری کلاس میں کوئی انگلش نہیں بولے گا۔ آر یو انڈر سٹینڈ؟''

دورِ جدید کی ان میڈموں اور علم کے ان محافظوں کو دیکھ کر تو وہ لطیفہ یاد آتا ہے کہ ایک عورت نے انگریزی کی نئی استانی سے پوچھا:

''آر یو نیو انگلش ٹیچر؟''

تو نیو انگلش ٹیچر نے جواب دیا: ''یس آئی آر۔''

قارئین سمجھ ہی چکے ہوں گے۔ اللہ ہم پر رحم فرمائے اور ہمارے اساتذہ پر بھی اور انھیں صحیح معنوں میں اشاعتِ علم کی توفیق دے۔ آمین۔

بدعت کی برائی

عنصر۔ کراچی

حضرت امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جو شخص بدعت ایجاد کرتا ہے (یعنی دین میں نئی بات گھڑتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے دور میں دین میں شامل نہیں تھی) اور اس بات کو اچھا سمجھتا ہے، وہ گویا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اللہ معاف فرمائے) رسالت کی ادائیگی میں خیانت کی، رسالت کا حق ادا نہیں کیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے۔''

''آج تم پر اپنا دین مکمل کرلیا۔''

امام مالک مزید فرماتے ہیں:

''جو کام اس زمانے میں دین نہیں تھا، وہ آج بھی دین نہیں بن سکتا۔'' (اعتصام 371/1)

روشنی کا سفر

ادب روشنی ہے تو بچوں کا ادب آیندہ نسلوں کے لیے روشنی کا سفر ہے۔ بچوں کے ادب پر ملکِ عزیز میں خوب کام ہو رہا ہے... اس سلسلے میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ بچوں کا ادب کے ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر صاحب نے ایک بہت بھرپور جائزہ لیا ہے... بچوں کا ادب کے 25 سالوں کا تجزیہ کیا... اور اپنی تمام تر تحقیقات کی روشنی میں ایک کتاب مرتب کی... یعنی اس میں پچیس سالوں کے دوران بچوں کے ادب کے سلسلے میں جو جو کچھ بھی ہوا، وہ سب اس کتاب میں جمع کر دیا اور اس کا نام رکھا روشنی کا سفر۔ مثال کے طور پر انھوں نے بچوں کا اسلام کے حوالے سے یہ الفاظ لکھے:

''روزنامہ اسلام کراچی کے تحت جون 2002ء کو بچوں کے ہر دل عزیز ادیب اشتیاق احمد کی ادارت میں ہفتہ وار میگزین ''بچوں کا اسلام'' کا اجرا ہوا۔ بچوں کا اسلام بہت جلد ملک بھر کے بچوں کا ہر دل عزیز میگزین بن گیا۔ چار رنگوں میں سولہ صفحات پر مشتمل بچوں کا اسلام ہر اتوار کو ایک لاکھ سے زیادہ تعداد میں شائع ہوتا ہے۔

''بچوں کا اسلام'' کو جدید تقاضوں یعنی انٹرنیٹ سے منسلک کرنے اور بچوں کے لیے نت نئی سرگرمیوں کے لیے دسمبر 2011 کو بچوں کا کلب کا آغاز ہوا۔

کتاب میں پاکستان کے قیام سے لے کر اب تک بچوں کا ادب کن مشکلات کا شکار رہا ہے... اس کا جائزہ بھی لیا گیا ہے:

بہر حال میرے خیال میں یہ ایک بہت مشکل ترین کام تھا... جو آخر ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر صاحب کر گزرے ہیں اور بہت ہی خوبی سے کر گزرے ہیں... کتاب کو پڑھ کر یہ احساس بہت قوی ہو جاتا ہے کہ اب ملکِ عزیز میں بچوں کا ادب لاوارث نہیں ہے... (مدیر)

فیل ہونے سے پہلے

محمد نصیر ہزاروی ۔ کراچی

دسمبر 1980 کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی شام تھی۔ 30 سالہ خوبرو جوان خورشید بیگ پریشانی کے عالم میں اپنے گھر کے صحن میں ٹہل رہا تھا۔ ماتھے پر اُبھری ہوئی بے شمار شکنیں، اُلجھے ہوئے بال اور میلے کچیلے کپڑے اُس کی پریشانی کا منہ بولتا ثبوت تھے۔

اچانک اندر کمرے سے بچے کے رونے کی آواز سنائی دی اور وہ جلدی سے کمرے کی طرف چل پڑا۔ کمرے میں بچھی ہوئی دو چارپائیوں میں سے ایک چارپائی پر اُس کا تین سالہ بیمار بچہ نوید بیگ رو رہا تھا اور خورشید بیگ کی بیوی اُس پر جھکی ہوئی اُسے چپ کرا رہی تھی۔ قدموں کی آہٹ سن کر وہ مڑی اور خورشید بیگ سے مخاطب ہو کر بولی:

''پلیز! اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ اس کی سانس اُکھڑ رہی ہے۔''

''بیگم تمہیں پتا ہے کہ اب میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے اور ڈاکٹر آپریشن کے لیے پچاس ہزار روپے طلب کر رہے ہیں۔''

''میں کچھ نہیں جانتی۔ میرے بچے کو بچالو۔ خدا کا واسطہ ہے، اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔'' بیگم خورشید پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''بیگم! حوصلہ کرو۔ تمہارا زیور ہم پہلے ہی بیچ چکے ہیں۔ میں نے اپنی موٹر سائیکل تک بیچ کر اس کے علاج پر لگا دی۔ اب اس مکان کے سوا بیچنے کے لیے اور کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس۔''

''تو خدا کے لیے اس مکان کو بیچ دو۔ میرے بچے کو ہسپتال لے چلو۔''

''کیا!'' خورشید بیگ تیز لہجے میں بولا۔ ''مکان بیچ دوں۔ یہ میرے بابا کی آخری نشانی رہ گئی ہے میرے پاس اور تم کہتی ہو اسے بھی بیچ دوں۔''

''ہاں، ہاں! سب کچھ بیچ دو۔ میرے نوید کو بچالو۔ سب! کچھ بیچ دو۔'' بیگم خورشید بیگ مجنونانہ انداز میں چلائی۔

خورشید بیگ پریشانی کے عالم میں ایک مرتبہ پھر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ گہری سوچ میں گم تھا۔ کمرے میں نوید بیگ کے رونے کی آواز اور بیگم خورشید بیگ کی سسکیوں کی آواز گونج رہی تھی۔ چند منٹ یونہی گزر گئے۔ آخر خورشید بیگ کی آواز کمرے میں اُبھری۔ ''ٹھیک ہے! بیگم میں یہ مکان بیچ دیتا ہوں۔ ہمارے پڑوسی کامل شاہ کو اس مکان کے خریدنے میں کافی دلچسپی ہے۔ میں اس کے پاس جا رہا ہوں اور مکان کا سودا کر کے ہی آؤں گا۔ ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ رقم تو ضرور ایڈوانس مل جائے گی۔ تم ہسپتال چلنے کی تیاری کرو۔'' یہ کہہ کر خورشید بیگ تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

O

دسمبر 2011 کی سرد اور تاریک رات اپنے پَر پھیلا چکی تھی۔ بوڑھا خورشید بیگ پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ بیگم خورشید کمبل اوڑھے چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کے کراہنے کی آواز سنائی دے رہی تھی، اس میں تکلیف کی شدت نمایاں محسوس ہو رہی تھی۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور نوید بیگ کمرے میں داخل ہوا۔ قدموں کی آہٹ سن کر خورشید بیگ اُدھر متوجہ ہوا۔ نوید بیگ کا لٹکا ہوا چہرہ دیکھ کر خورشید بیگ سمجھ گیا کہ وہ ناکام لوٹا ہے۔ پھر بھی وہ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

''بابا جان! مجھے افسوس ہے! اتنی بڑی رقم کا انتظام مجھ سے نہیں ہو سکا اور مزید کوئی چیز ہے میرے پاس ایسی نہیں جسے فروخت کر کے رقم کا انتظام کیا جا سکے۔''

''پھر تمہاری ماں کے علاج کا کیا ہوگا؟''

اس سوال کا جواب نوید بیگ کے پاس نہیں تھا۔ وہ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ چند لمحے کمرے میں گھمبیر خاموشی چھائی رہی۔ صرف بیگم خورشید بیگ کی کراہنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔

''اب بس ایک ہی حل بچا ہے ہمارے پاس۔'' خورشید بیگ کھڑکی سے باہر خلاؤں میں گھورتا ہوا بولا:

''وہ کیا بابا جان؟''

''وہ یہ کہ ہم یہ مکان بیچ دیں۔''

''کیا!!! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' نوید بیگ حیرت سے اُچھل پڑا۔

''اس کے سوا ہمارے پاس آپریشن کے لیے اتنی بڑی رقم کے انتظام کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''لل... لیکن۔'' نوید بیگ کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ ''ٹھیک ہے میں رابعہ سے مشورہ کرلوں۔''

''ہاں کر کے دیکھ لو۔'' خورشید بیگ نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا اور نوید اپنی بیوی رابعہ سے مشورہ کرنے کمرے سے نکل گیا۔

پندرہ بیس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ نوید بیگ اور اس کی اہلیہ رابعہ کمرے میں داخل ہوئے۔ خورشید بیگ اپنی بیگم کی چارپائی کے پاس ہی کھڑا تھا۔ بیگم خورشید ہوش میں تھی مگر کمزوری کی وجہ سے بولنے کی سکت نہیں تھی۔

''بابا جان! میں نے رابعہ سے مشورہ کر لیا ہے، لیکن یہ مکان بیچنے پر قطعاً تیار نہیں ہے۔'' نوید بیگ بولا۔

''اور نوید بیگ تم؟'' خورشید بیگ نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

''ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں بابا جان! کہاں ہم کرایے کے مکانوں میں دھکے کھاتے پھریں گے۔''

خورشید بیگ نے ایک نظر اپنی بیگم پر ڈالی۔ بیٹے کی بات سن کر ایک رنگ اس کے چہرے پر آ کر گزر گیا تھا۔ خورشید بیگ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دکھ بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''آج سے تقریباً اکتیس سال پہلے یہی دسمبر کا سرد مہینا تھا اور نوید بیگ تم موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھے اور تمہارے علاج کے لیے ہمارے پاس مکان بیچنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ تب بیٹے کی محبت مکان کی ضرورت پر غالب آ گئی اور ہم نے اپنا آشیانہ کھو کر تمہیں پالیا تھا۔ ممتا کی محبت اس امتحان میں سرخرو ہوئی، لیکن آج بیٹے کی محبت اس امتحان میں فیل ہو گئی۔ ہاں نوید بیگ تم ہار گئے۔'' خورشید بیگ کی آواز رندھ گئی اور موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر بہنے لگے۔ نوید بیگ کا سر شرم سے جھکتا چلا گیا۔

اچانک بیگم خورشید کے بدن میں کپکپاہٹ سی پیدا ہوئی۔ خورشید بیگ نے چونک کر بیگم کی طرف دیکھا جس نے ساری باتیں سن لی تھیں۔ اُس کا کانپتا ہوا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور ہونٹوں میں تھرتھراہٹ پیدا ہوئی۔ جیسے وہ نوید بیگ کو قریب بلا کر کچھ کہنا چاہتی ہو۔ پھر اچانک اسے ایک لمبی اور تیز ہچکی آئی اور فضا میں بلند ہاتھ جھٹکے سے نیچے گر گیا اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ خورشید بیگ تیزی سے بیگم پر جھکا۔ دل کی دھڑکن دیکھی۔ نبض دیکھی، لیکن زندگی کے کوئی آثار نہ پا کر وہ شکست خوردہ انداز میں سیدھا ہوا اور بیٹے کی طرف متوجہ ہو کر بولا:

''لو بیٹا! زندگی کی آخری بازی بھی ممتا کی محبت جیت گئی۔ تمہیں فیل ہونے سے بچانے کے لیے زندگی کی قربانی دے دی۔ بھلا ماں اپنے بیٹے کو کسی امتحان میں فیل ہوتا کیسے دیکھ سکتی تھی۔''

Prepared With Pure Desi Ghee

JOHAR

SWEETS★BAKERS★NIMCO

Decent Apartment, Johar Turn, Gulistan-e-Jouhar
Block-19, Rashid Minhas Road, Karachi. Tel: 34621078

Kidz n Kidz
SMART LITTLE FASHION!
Complete Children Garments Range...
winter
COLLECTION 2013-14
www.kidznkidz.com.pk
facebook.com/kidznkidz
KARACHI OUTLETS
| Dolmen Mall (Tariq Road) | Bahadurabad (Dolmen Arcade) | Millennium Mega Mall
| Saima Mall & Residency (Gulshan) | Al-Madni Shopping Mall | Saima Paari Mall (Hyderi)
HYDERABAD | GUJRANWALA | LAHORE | RAWALPINDI
For More Information Please Contact . 0321-828-7487